ضروری باتیں

۲۰۱۹ء کا نوبیل انعام برائے امن ایتھوپیا کے وزیر اعظم ابی احمد کو دیا گیا ہے۔ ابی احمد کو یہ انعام اپنے بدترین دشمن ملک اریٹیریا کے ساتھ گزشتہ برس امن قائم کرنے کی وجہ سے دیا گیا۔ دشمن کو گلے لگانے کا یہ سبق احمد نے محمد سے سیکھا ہوگا۔ ادب کا نوبیل انعام گزشتہ برس (۲۰۱۸) کے لیے پولینڈ کی ادیبہ اور شاعرہ اولگا توکارچسک کو دیا گیا اور رواں سال (۲۰۱۹) کا یہ انعام آسٹریا کے پیٹر ہانڈکے کو دیا گیا۔

۲۰۱۸ میں ۲۰۱۸ کا ادب کے لیے نوبیل انعام نہ دینے کا سبب اس کمیٹی کا جنسی اسکینڈل تھا۔

۵۷ سالہ پولینڈ کی یہ ادیبہ اور شاعرہ اولگا توکارچسک اپنے ملک میں بڑی دانشور تسلیم کی جاتی ہیں۔ انھیں جدید پولستانی ادبی عہد کا ایک اہم ستون مانا جاتا ہے۔ اولگا توکارچسک ماہر نفسیات بھی ہیں اسی لیے ان کے کرداروں کے درمیان مکالموں اور کہانی پر ماورائی اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔

سویڈش اکیڈمی کے مستقل سیکرٹری میٹس مالم کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی تحریر میں ایسا بیانیہ اپنایا ہے جو سرحدوں سے ماورا اور وسیع تر علوم کا حامل ہے۔

ادب کا نوبیل انعام (۲۰۱۹) آسٹریا کے ڈرامہ نویس، انشائیہ پرداز اور ناول نگار پیٹر ہانڈکے کو دیا گیا ہے۔ سیکرٹری میٹس مالم نے کہا کہ ہانڈکے کی تحریریں انتہائی اثر انگیز ہیں اور انہوں نے آسان فہم انداز میں مخصوص انسانی جذبات کو بیان کیا ہے۔ کمیٹی کے مطابق دونوں ناول نگاروں، ادیبوں کو ان کی ادبی خدمات، اچھوتے خیالات اور آسان زبان میں اظہار خیال کی وجہ سے ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔

کوئی بھی ایوارڈ ہو، خدمات کا اعتراف اور تکریم وتحسین کے سند کی حیثیت رکھتا ہے حالانکہ حرف آخر بھی نہیں ہوسکتا۔ نوبیل انعام ہو یا پھر ہمارے یہاں کے گیان پیٹھ اور ساہتیہ اکادمی کے انعامات ہوں، حریفین کی جانب سے جانب داری کا الزام لگ ہی جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اب ہمارے یہاں عجیب وغریب تماشے بھی ہونے لگے ہیں۔ سال رواں میں ساہتیہ اکادمی کے انعام کے تعلق سے اکادمی کو فیس بک کے ذریعے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے پروفیسر شافع قدوائی صاحب کو ان کی کتاب ''سوانح سرسید: ایک بازدید'' (۲۰۱۹) کے لیے ان کے نام کا اعلان ہو چکا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کا یہ انعام ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ کو دیا جائے گا۔ سبھی حق گو اہل قلم، اہل علم اور دانشور جانتے ہیں کہ ساہتیہ اکادمی میں غیر جانب داری سے انعامات دیے جانے کی روایت ابھی بھی اپنے پورے وقار کے ساتھ زندہ ہے۔

این سی پی یو ایل کی جانب سے ۱۸ مارچ تا ۲۰ مارچ ۲۰۱۹ کو چھٹی سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ ۱۵ ممالک کے دانشور اور ادیب اور ۳۵ یونیورسٹیوں کے طلبا مدعو تھے۔ کراچی میں آرٹس کونسل کے زیر اہتمام چار روزہ (۵ دسمبر تا ۸ دسمبر ۲۰۱۹) بارہویں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ پہلے اجلاس کی صدارت ہمارے ملک ہندوستان کے پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ اس چار روزہ پروگرام میں بہت سی خامیاں بھی پڑھنے کو ملیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہاں ادب پر صحافت غالب تھی۔ اس کے علاوہ بدنظمی اور بدانتظامی کی شکایتیں بھی پڑھنے کو ملیں۔ یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یاں کی سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس ہر اعتبار سے چست درست تھی، بہترین تھی۔

''شب خون'' کا وتیرہ (''شب خون'' کے شمارہ نمبر ۲۷۹ صفحہ ۳ پر وتیرہ ت نہیں ط سے لکھا گیا ہے۔ کیا ''شب خون'' کے معیار واعتبار کو دیکھتے ہوئے اس املا کو بھی درست تسلیم کر لینا چاہیے؟) رہا ہے کہ نثری تخلیقات سامنے کے صفحہ سے شروع ہوتی تھیں۔ ''شب خون'' کے اس حسن کی تقلید میں 'سبق اردو' نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور نثری ہی نہیں بلکہ شعری تخلیقات میں بھی یہی طریقہ اپنایا گیا ہے۔

'سبق اردو' کے ادارتی بورڈ میں کچھ تبدیلی کی جا رہی ہے۔ جن لوگوں کی عمر ۶۵ سال سے زیادہ نہیں ہے وہی لوگ ادارتی بورڈ میں شامل کیے جا رہے ہیں تاکہ نئے لوگوں کی آمد بھی ہوتی رہے۔

'ریختہ' کے سنجیو صراف اردو کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں، ہمیں ان کے مثبت پہلو کی تعریف کرنا چاہیے، ہم فرشتے تو نہیں ہیں نا! کوتاہیاں تو سب سے ممکن ہیں۔ ان کی نیک نیتی کی وجہ سے ہم ان کے طرفدار ہیں۔

معروف افسانہ نگار، شاعر اور ناقد جناب بلراج بخشی اور محقق ڈاکٹر اجے مالوی مشترکہ طور پر ایک ضخیم سالنامہ جلد ہی منظر عام پر لا رہے ہیں جس کا نام ''تخلیقات'' ہے۔ اس دور میں نئے رسالے کا اجرا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہم ان کی ہمت کی داد دیتے ہیں، ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک اہم مضمون اس شمارے میں بھی شامل ہے۔

ہمارے استاد، ترقی پسند تحریک کے اہم ستون، ممتاز ادیب، ناقد اور دانشور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی {(پیدائش: ۱۱۰ اکتوبر ۱۹۲۸) سابق صدر، شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی} ۲۰ دسمبر ۲۰۱۹ کو جمعہ کے روز اپنے معبود حقیقی کے پاس چلے گئے ہیں۔

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی عظیم شخصیت اور ادبی خدمات پر گوشہ یا نمبر شائع کیا جائے گا۔ ●●

مدیر

سبق اردو

جلد :۴، شمارہ : ۳ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم
پریس: جے بجرنگ پریس، گوپی گنج، ضلع بھدوہی یو پی۔
فی شمارہ: ۱۰۰ روپئے، ۱۲ شمارے: ۱۰۰۰ روپئے، بیرون ملک: پچاس امریکی ڈالر
چک، ڈرافٹ: SABAQ-E-URDU(Monthly)
انٹرنیٹ بینکنگ: SABAQ-E-URDU (Monthly)
IFSC BARB 0 GOPI BS A/C 28240200000214

sabaqeurdu.com
ISSN 2321-1601
SABAQ E URDU(Monthly)
GOPIGANJ-221303,BHADOHI(UP)INDIA
Mobile & Whats App 9919142411,9696486386
sabaqeurdu@gmail.com
roznamaazeemindia@gmail.com

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کے سنوائی صرف ضلع بھدوہی کی عدالت میں ہی ہوگی۔ ادارہ

مدیر	ضروری باتیں	۱
پروفیسر گوپی چند نارنگ	اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات	۳
رفیق راز	تفتیش	۱۱
رفیق راز	غزل	۱۲
رفیق راز	غزلیات	۱۳
رفیق راز	غزلیات	۱۴
محمد یوسف ٹینگ	رفیق راز۔نہر شرر کا ساربان	۱۵
علی محمد فرشی	نظمیں	۱۷
عبدالحی	مغربی بنگال کی ادبی صحافت: ماضی و حال	۲۱
ڈاکٹر حنا آفریں	غضنفر کی خاکہ نگاری۔'روئے خوش رنگ' کے حوالے سے	۲۷
فراغ روھوی	رباعیات	۳۵
گلزار جاوید	روح کا موسم	۳۷
قیوم خالد	بے سِمت راستوں کے مُسافِر	۴۳
ڈاکٹر جی۔ ایم ۔ پٹیل	میرے ہم نفس میرے ہم نوا	۴۵
ڈاکٹر محمد اکبر	راشدالخیری بحیثیت مضمون نگار	۴۹
ڈاکٹر اجے مالوی	سوانحی اشارے نند کشور وکرم	۵۵
فرحت نواز	"حیاتِ مبارکہ حیدر"	۵۷
مصنف: رمیش پوکھریال نشنک مترجم: محمد نہال افروز	قطرہ قطرہ موت (ترجمہ: ہندی سے اردو)	۵۹
ڈاکٹر فریاد آزر	غزلیں	۶۳
ڈاکٹر نسرین بیگم	شام تنہائی	۶۵
ڈاکٹر زیبا محمود	اجمل سلطانپوری	۶۷
مجتبیٰ حسین	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۷۱
انوار فطرت	انگریزی شاعری میں ماہِ دسمبر کا استعارہ	۷۳
ظفر اقبال	فیض احمد فیض کی شاعری کا ایک اکیڈیمک جائزہ	۷۵
کشور ناہید	غنچے کے مزار پر لکھی نظمیں	۷۷
ساہتیہ اکادمی	مجروح سیمینار	۷۸
این سی پی یو ایل		۷۸
خلیل احمد بیگ	جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	۷۹
ادارہ	ایڈیٹوریل بورڈ	۸۰

چیف اڈیٹر
ڈاکٹر دانش الہٰ آبادی

پروفیسر گوپی چند نارنگ

اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات

(قسط اول)

گوپی چند نارنگ کا پہلا مضمون جو ۱۹۵۸ میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد میں پڑھا گیا اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اسے نوائے ادب ممبئی میں شائع کیا۔

اردو زبان اسلامی اور ہندستانی تہذیبوں کے سنگم کا وہ نقطۂ اتصال ہے، جہاں سے ان دونوں تہذیبوں کے دھارے ایک نئے لسانی دھارے کے بطور ایک ہوکر بہنے لگتے ہیں۔ اردو کے چمن زار میں جہاں لالہ وگل، نسرین وسمن نظر آتے ہیں وہاں سرس اور ٹیسو کے پھول بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی آبیاری کسی ایک مذہب کی مرہونِ منت نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اردو ادب میں رواداری، محبت اور اخوت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود ہندوؤں اور مسلمانوں کا سابقہ۔ اردو ادب میں اتحاد اور یگانگت کی روایت کسی دباؤ کی پیداوار نہیں ہے اس کی پشت پر ایک ہزار سال کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ اس نے باہمی علاحدگی اور دوری کی خلیج کو پُر کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کعبے کو شوالے سے اور ہندو کو مسلمان سے جوڑے رہا ہے اور جوڑے ہوئے ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اردو ادب کے ان ہی رجحانات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جس ملواں یا سدھکڑی بولی کے سانچے میں اردو ادب نے ڈھلنا شروع کیا تھا، اس کا خمیر پنجاب وملتان کی سرزمین میں تیار ہوا تھا۔ تاریخ ادب اردو کا یہ حصہ ابھی تاریکی میں ہے لیکن جو حقائق دستیاب ہوئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب کے اس ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اہل قلم بھی موجود تھے۔ ان میں چندر بھان برہمن، منشی ولی رام ولی، بدھ سنگھ اور رام کشن کے نام دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ولی دکنی کا دیوان ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا۔ ولی رام ولی شاہجہاں کے بیٹے دارا شکوہ کے مشیر خاص تھے۔ ان کی مثنوی شش وزن مطبع نادر العلوم میں چھپ چکی ہے۔ (1) بدھ سنگھ کا زمانہ اٹھارویں صدی کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے۔

دکن میں بھی نظامی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور ولی کے زمانے میں کئی ہندو شاعر بھی موجود تھے۔ لیکن صرف تین کے نام ہم تک پہنچتے ہیں۔ سیوک، رام راؤ اور جسونت سنگھ منشی، سیوک نے جنگ نامہ لکھا، رام راؤ نے واقعاتِ شہادتِ حسینؑ پر ایک کتاب قلم بند کی۔ منشی اورنگ زیب کے گورنر سعادت اللہ خاں کے دربار میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے اور ان کی تصنیفات اردو، فارسی دونوں میں ملتی ہیں۔

محمد شاہ کے عہد سے شمالی ہندوستان میں بھی اردو شعر وشاعری کا چرچا ہونے لگا تھا، خواص فارسی سے ہٹ کر اردو کی طرف رجوع کرنے لگے تھے۔ اور آنے والے پچاس سال میں زیادہ تر شمالی ہندوستان کے ہندو و مسلمان اس زبان میں دادِ سخن دینے لگے۔ اردو ادب کے اس تکوینی دور میں ٹیک چند بہار، آنند رام مخلص، بندرابن راقم، آفتاب رائے رسوا، خوش وقت رائے شاداب، عجائب رام منشی، بدھ سنگھ قلندر، بھکاری داس عزیز، راجہ رام ذرہ، بال کمند حضور، ماسٹر رام چندر، رائے سرب سنگھ دیوانہ، جسونت سنگھ پروانہ اور راجہ رام نرائن موزوں، ان ہندو اہل قلم حضرات سے ہیں جنھوں نے اردو ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔

اردو کی قدیم ادبی روایات میں سب سے اہم مشاعروں کا رواج ہے۔ مشاعرے ہند ایرانی تہذیب کا وہ ورثہ ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو منتقل ہوا اور ہندوستان کی اپنی چیز بن کے رہ گیا۔ مشاعروں کا رواج اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا اولین مظہر ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مشاعرہ منعقد ہوا ہو جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو شریک نہ ہوئے ہوں۔ شعر وشاعری کی یہ مجلسیں ہر زمانے میں عام رہی ہیں۔ ان کے چند در چند رسوم وآداب مقرر تھے جن کا احترام ہندو و مسلم دونوں کے لیے واجب سمجھا

جاتا تھا۔ایک دوسرے کے زانو بہ زانو بیٹھ کر ہندو و مسلم اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ مشاعروں کا انعقاد عموماً کسی صاحبِ حیثیت کے گھر پر ہوتا تھا۔ اردو کے قدیم مشاعروں کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ میزبان کبھی کبھی ہندو بھی ہوتے تھے، بعض اوقات مشاعروں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لایا جائے۔ ایسی ہی ایک کوشش لکھنؤ کا وہ مشاعرہ [1] تھا جو 'آئینہ ہندوستان' کے نام سے مشتہر ہوا۔ یہ مشاعرہ ہری سرن داس کے دولت خانہ پر منعقد ہوا تھا، اس کے علاوہ منشی پچھمن پرشاد صدر اور رنگ بہاری لال سوسن کے ہاں لکھنؤ میں برسوں مشاعرے ہوتے رہے۔ دہلی میں ایسے مشاعرے امرناتھ ساحر، پیارے لال رونق اور چندی پرشاد شیدا کے زیر اہتمام 1920 تک ہوتے رہے۔ کنور بدری کرشن فروغ سکندر آباد کے رئیس ان مشاعروں کے بانی تھے۔ [2] اس طرح مسلمانوں کے گھر ہندوؤں اور ہندوؤں کے گھر مسلمانوں کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔اور اس وقت کی سوسائٹی ان تعلقات میں کسی تفاوت کو روا نہ رکھتی تھی۔

استادی اور شاگردی کی روایت بھی اردو میں فارسی اثر سے آئی، ہر استاد کے بے شمار شاگرد ہوتے تھے جو اُن کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، حتیٰ کہ ادبی مناظروں میں اگر کوئی ایسی نوبت آتی تو اپنے ہم مذہبوں سے مقابلہ کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں اردو کے چند اُن ہندو شاعروں کا ذکر بے جا نہ ہوگا جنھوں نے مسلمان شاعروں کے سامنے زانو ادب تہہ کیا۔ ذیل میں ہر اُستاد شاعر کے سامنے اُس کے ہندو شاگردوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:

مرزا جان جاناں مظہر	کشن چند مجروح
خان آرزو	ٹیک چند بہار، اور آنند رام مخلص
میر تقی میر	بندرابن راقم، جسونت سنگھ دیوانہ، شیو کمار وفا اور منولال صفا
مرزا قتیل	خیالی رام خیالی اور لال چند انس
شاہ حاتم	خوش وقت رائے شاداں، اور مکند سنگھ فارغ
سودا	لچھمی رام فدا
شاہ نصیر	خوب چند ذکا، منولال پریشاں، رام پرشاد شاد، چنڈو لال شاداں، گنگا داس ضمیر، دھومی لال طرب، موتی لال طرب، رام سکھ عاشق، عزت سنگھ عیش، موہن لال منعم، گھنشام رائے عاصی، دولت رام عبرت، خیالی رام عیاش، مہتاب سنگھ غم، دولت سنگھ لطیف، مول چند منشی، مٹھن لال نامی، صاحب رام راقم، گوبند رائے نصرت، اور مہاراج سنگھ عزیز، جس نے بعد وفات شاہ نصیر، ان کے کلام کو جمع کیا تھا۔
انعام اللہ خاں یقین	شیو سنگھ ظہور اور چنتا رام عمدہ
میر درد	نرائن داس بیخود، جھمن ناتھ جھمن، بال مکند حضور اور بکھاری لال عزیز
غالب	دیبی دیال نامی، شوجی رام مونس، ہر گوپال تفتہ، لچھمی نرائن مفتوں اور بالمکند بے صبر
مومن	منولال شاد، اور بشن پرشاد فرحت
ذوق	بال مکند بے صبر، پیارے لال ظہیر، بہاری لال مشتاق، دولت رام شفق، کنور سین عزیز اور موہن لال موہن
امام بخش صہبائی	درگا پرشاد نادر
ناسخ	رام سہائے رونق، فتح چند شائق، جواہر سنگھ جوہر، رام دیال سخن، سندر لال بسمل، اور چھنو لال طرب، دوارکا پرشاد افق بھی ناسخ سے عقیدت رکھتے تھے
آتش	جیا لال بہادر، کنور گوپال سہائے صور، دیا شنکر نسیم اور جگل کشور ظہور
مصحفی	کانجی مل صبا، بنی پرشاد ظریف، ٹیکا رام تسلی، کنور سین مصحفی اور موجی رام موجی
انشا	اسیری سنگھ نشاط، مکھن لال آرام
میر حسن	گنگا سنگھ قادر
جرأت	منگل سین الفت، گنگا پرشاد رند، اور اجودھیا پرشاد حسرت
امانت	بھگونت رائے امانت، دیناناتھ جوہر، گنگا پرشاد رحمت، کدارناتھ فرحت، نالنھو جی مروت اور شیو پرشاد ناظم
وزیر	دھنپت رائے راز
سعادت یار خاں رنگین	پورن سنگھ پورن
قدرت اللہ خاں قدرت	عجائب رام منشی
میر سوز	موتی لال حیف
محمد حسین آزاد	کشن لال طالب اور کیسرا سنگھ جہانگیر
داغ	برج نرائن کشمیری، رام چندر بیتاب، راجہ ہر کشن سنگھ، دیبی پرشاد مائل، شیونندن بہار، نرائن پرشاد مہر اور تر بھون ناتھ زار
امیر مینائی	جوالا پرشاد برق
ریاض خیر آبادی	شام سندر لال برق، مولا رام بسمل اور ہری روت سنگھ خوشتر
سید کرامت حسین	سرور جہاں آبادی
آزاد بلگرامی	دیا رام پنڈت
جلال لکھنوی	میکو لال عشرت
نوح ناروی	درباری سنگھ شاطر، اودھ پرشاد کشتہ، سکھ دیو پرشاد بسمل، بیلی رام، مہیش پرشاد سوگ
عزیز لکھنوی	جگت موہن لال رواں، شیر سنگھ شمیم
تاجور نجیب آبادی	کیشو داس عاقل
برکت اللہ رضا	آنند نرائن ملا

اسی طرح کئی مسلمان شاعر بھی ہندو استادوں کے خوشہ چین رہے۔ وہی یک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زُنار کہتے ہیں

جعفر علی حسرت، جو قلندر بخش جرأت کے استاد تھے، رائے سرب سنگھ دیوانہ کے کہتے ہیں

شاگرد تھے۔ میاں بسمل، میاں مشکل، میر تراب علی عادل اور میر حیدر علی خزاں کا شمار (ٹیک چندر بہار)

تلامذہ بختاور سنگھ غافل میں ہوتا ہے۔ کھیم نرائن رند، مولوی حفیظ الدین شہید اصلاح مطلب ایک ہے آگاہ نا آگاہ کا ہے الک کا ترجمہ عربی میں لفظ اللہ کا

بنسی دھر ہمت، باقر علی کے استاد تھے۔ (جواہر سنگھ جوہر)

اردو ادب میں اتحاد پسندی کے جو رجحانات پائے جاتے ہیں، یہ اس کا عملی پہلو تھا سجدہ پہ نہیں موقوف کچھ اے غافلو یار کو سجدہ سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

اب اردو کے ادبی مواد سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اردو کے اصناف سخن میں (مادھو رام جوہر)

غزل سب سے اہم ہے۔ غزل میں ہندو مسلم رواداری کی جو فضا پائی جاتی ہے اس کا مکمل آئینہ ہے دیر و حرم حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف

اندازہ ذیل کے اشعار میں لگایا جا سکتا ہے: (دیا شنکر نسیم)

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و میخانہ دیکھیا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ حرم ہیں شیخ و برہمن کے واسطے ہم جن کو پوجتے ہیں وہ پتھر ہی اور ہیں

کوں مکھ کا فضا (کیسرا سنگھ جہانگیر)

(قلی قطب شاہ) دیر و حرم میں جلوۂ قدرت ہے آشکار زُنار و سبحہ میں نہیں فرق ایک تار کا

مشرب عشق میں ہیں شیخ و رشتہ سبحہ و زنار کوئی کیا جانے (راجہ کشن کمار وفا)

برہمن یکساں اپنا تو سر جھکے ہے دونوں طرف کہ اُس کی تصویر بتکدے میں اور ہے حرم میں خاکا

(سراج دکنی) (پیارے لال آشوب)

کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے یہ دونوں ایک ہیں ان کے بیچ رشتہ جیسے گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

میں مت بولو (چکبست)

(آبرو) ایک ہی جلوہ میانِ دیر و کعبہ ہے مگر اتفاق رائے شیخ و برہمن میں کیوں نہیں

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو (شیر پرشاد دہی)

قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا، ایسی کئی مثالیں اردو نظم سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔

(میر) اردو کے شاعروں نے مذہب کے ظاہری لوازمات کی جو خلوص سے عاری ہوں

رام و رحیم کی سمرن ہے شیخ و ہندو کو دل اس کے نام کی رٹنا رٹے ہے کیا کیجیے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ وہ دیواریں ہیں جو ہندو کو مسلمان

(ولی اللہ شاگرد سودا) سے اور مسلمان کو ہندو سے جدا رکھتی ہیں:

کیسا مومن، کیسا کافر، کون ہے صوفی، کیسا رند یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں

بشر ہیں سارے بندے حق کے سارے جھگڑے شر کے ہیں (چکبست)

(ذوق) اور چونکہ مذہب کی یہ روایتی بندشیں فاصلہ پیدا کرتی ہیں، وہ دل حق بیں کو ان سے

مشرب صلح کل ہے اے زاہد دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں:

(امیر مینائی) بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زنار کے جھگڑے

سر نیاز سلامت رہے پئے تسلیم نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

(داغ) اذاں دیتے ہیں بُت خانے میں جا کر شانِ مومن سے

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

کیا کہیں گے تمھیں سب گبر و مسلماں دل میں (چکبست)

(جلیل) اقبال نے بہ بانگِ دُہل کہا تھا کہ ہم سب ہندی ہیں اور مذہب ہمیں آپس

تمھارا بول بالا ہر جگہ ہے اللہ والوں میں میں بیر نہیں سکھاتا، اردو کے شاعر اسی ہندوستانی جذبے کے پیامبر ہیں۔ وہ قوم کی

یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جپ تپ شوالوں میں شیرازہ بندی کے آرزومند ہیں، خارجی عوامل نے جب کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں

(ثاقب بدایونی) کے درمیان چپقلش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اردو شاعروں نے اُسے اچھی نظر

ہندو غزل گو شاعروں کے ہاں بھی ایسے جذبات تلاش کیے جا سکتے ہیں اور حق تو یہ سے نہیں دیکھا:

ہے کہ یک جہتی کا یہ ترنم غزل کے زیر و بم میں ہمیشہ موجود رہا ہے: قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے طرز ہندو دیکھ کر طرز مسلماں دیکھ کر

(چکبست)

اور وہ ان عوامل کو کفر کے حملوں سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ فتنہ وفساد نہ تو اسلام میں جائز ہے نہ ہندوازم میں:

زک اگر کفر کے حملوں سے نہ ایماں پائے سرگ ہندو کو ملے خلد مسلماں پائے
(دوارکا پرشاد افق)

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعد پیدا کرنے کی جو کوششیں اب سے قبل پوری ایک صدی جاری رہی ہیں، اردو کے اہلِ قلم انھیں ہمیشہ ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حادثہ کان پور 1931 میں منور لکھنوی نے لکھا تھا:

پھرا ہے کس لیے سر ہندو و مسلماں کا لگا ہے خون یہ انساں کے منھ کو انساں کا
جنونِ قتل کے قبضہ میں زندگی آجائے ہزار حیف کہ غالب درندگی آجائے

اس کے باوجود وہ ناامید نہیں ہوتے کیونکہ وطن کے سینے میں جب شہادت کی شمع جاگ اٹھتی ہے تو اس کی آنچ میں دل موم کی طرح پگھل جاتے ہیں:

یہ خون دلِ غمزدہ کو بھر دے گا یہ خون ہندو و مسلم کو ایک کر دے گا
(منور)

اردو کے شاعر مجموعی طور پر اتحاد کی مشعل کو روشن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ جب اس کے نور سے کعبہ دل جگمگا اٹھتا ہے تو منافرت کی دھند خود بخود چھٹ جاتی ہے۔

آندھیوں کے جھگڑے یکدم سبھی بھلادیں آ دل سے امتیازِ دیر و حرم مٹادیں
کر کے چراغ روشن پھر اتحاد کا ہم جنت سے بڑھ کے دل کے کعبے کو جگمگادیں
(لال چند فلک)

اسلام اور ہندو مذہب میں جو بھی صداقتیں ہیں، اردو کے شاعران کے عاشق و دلدادہ ہیں، وہ انھیں سمیٹ لینے کی تلقین کرتے ہیں:

حرم کو جاؤ تو رستے سے دیر کے جاؤ دعائیں لے کے بتوں کی خدا کے گھر کو چلو

اور وہ مذہب کے اس نظام کہنہ کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں جو عصبیت سکھاتا ہے، وہ اُس بیجان، فرسودہ اور روایتی رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جو دل کو دل اور انسان کو انسان سے دور رکھتا ہے:

آ غیرت کے پردے اک بار پھر اُٹھادیں بچھڑوں کو پھر ملادیں نقش دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
(اقبال)

اس نئے شوالے کا ایمان شاعری کی سطح پر ایمان اتحاد ہے، جس کے لیے وہ یوں دست بدعا ہیں:

باقی رہے نہ ہندو و مسلم میں کچھ بھی فرق ہوجائیں ایک مثل دل و جاں خدا کرے
ایمان اتحاد پہ لائے ہر اک نفس قائم ہو اتحاد کا ایماں خدا کرے
عیسائی ہوں، ہنود ہوں، مسلم ہوں خواہ سکھ سب نام پہ ہوں صلح کے قرباں خدا کرے
(منور)

———

تخلص رکھنے کا رواج ہندوؤں نے مسلمانوں سے لیا، جہاں سے یہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں پھیل چکا ہے، اردو کے ہندو شاعروں کے نام سے ان کا اصلی نام ہٹالیا جائے اور صرف تخلص رہنے دیا جائے تو بعض اوقات یہ شک ہی نہیں گزرتا کہ وہ ہندو ہیں۔ قدیم ہندو شاعروں میں کئی ایسے تخلص ملتے ہیں جو خالص اسلامی ہیں: مثلاً رام ولی، رام دین اکبر، نہال سنگھ طوبیٰ، رگھبیر دیال آثم، یا جوالا پرشاد آذر وغیرہ وغیرہ۔

———

باہمی رواداری اور مذہبی فراخدلی کا رنگ قدیم اردو ادب میں اتنا گہرا رہا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان مصنفین اپنی کتابوں کی ابتدا سری گنیش یا سرسوتی کی مدح سے کرتے، اور ہندو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یا ایسے دوسرے متبرک کلموں کا ذکر اپنی تالیف کے آغاز میں ضروری سمجھتے تھے، ایک دوسرے کے مذہبی القاب کا استعمال اس سے پیشتر ہندوستان کے فارسی ادب میں پایا جاتا ہے۔
ڈاکٹر تاراچند رقم طراز ہیں:

> ''رحیم نے 'مدناستکا' سری گنیش نامہ لکھ کر شروع کیا۔ جہانگیر کے عہد کے ہندی مصنف احمد نے بھی اپنی تالیف 'سامدریکا' میں یہی کیا ہے۔ احمد اللہ دکشنا نے اپنی تصنیف 'نیا کا بھید' میں سری رام جی سہائے، سرسوتی اور گنیش کا نام لیا ہے۔ یعقوب نے 'راشا بھوشن' لکھی تو سری گنیش جی، سری سرسوتی جی، سری رادھا کرشن جی اور سری گوری شنکر جی کے فضل و رحمت کا طالب ہوا ہے۔ غلام نبی رسلین نے اپنی دو کتابوں 'نگادرپنا'، 'راسا پربودھ' کا آغاز سری گنیش نامہ لکھ کر کیا ہے۔ 'اعظم خاں' نے محمد شاہ کے حکم سے سنگار درپن لکھی تو رامانج کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ لقمان نامی ایک مولف نے طب پر کوئی رسالہ لکھا ہے۔ اس کا آغاز بھی گنیش جی کی مدح سے ہوا ہے۔ سید پوہر کی طبی کتاب 'رس رتنا کر' میں بھی گنیش جی کے ساتھ نیازمندی دکھائی گئی ہے۔''(1)

قدیم اردو ادب میں بھی یہ روایت برابر قائم رہی ہے۔ دکن کے ابتدائی مسلمان شاعروں نے جہاں جہاں بھی کوئی حمد لکھی ہے، اس میں کرتار، آدھار، ستگورہ، نرنکار، پتیم اور شیام موہن کے الفاظ کو عموماً استعمال کیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں بھی یہ رواج عام تھا۔ اہل ہنود کی لکھی ہوئی اس زمانے کی شاید ہی کوئی تصنیف ہوگی جو اسلامی القاب سے شروع نہ کی گئی ہو۔ آنند نرائن مخلص نے اپنا سفرنامہ، شیو پرشاد وہبی نے اپنا کلیات مسمی مرقع ارژنگ دیبی پرشاد بشاش نے اپنا تذکرہ شعرائے ہنود، فراقی نے وقائع عالم شاہی، دیبی پرشاد سحر بدایونی اور برج باشی لال عاصی نے اپنا دیوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا ہے۔
منشی بال مکند بے صبر نے اپنے دیوان خاص کی ابتدا اس شعر سے کی ہے:

سر دیوان پہ گر حرف توحید وحید آیا تو سب اپنا سخن تفسیر قرآن مجید آیا

اور دیوانِ عام یوں شروع ہوتا ہے۔

جیسےکہ گر بسم اللہ وصفِ عارضِ جاناں ہوا مطلعِ خورشید اپنا مطلعِ دیواں ہوا

جگن ناتھ خوشتر نے واجد علی شاہ کے عہد میں بھاگوت منظوم لکھی تھی، اس کا ابتدائیہ ہے:

گل افشاں حمد باری میں قلم ہے — بیاضِ نامہ گلزارِ ارم ہے

منشی چمن لال نے سنگاسن بتیسی کو نظم کیا تھا، اُس کے دیباچہ میں لکھا ہے:

الٰہی سبز کر میرے سخن کو — بہارِ بے خزاں دے اس چمن کو

اس کے علاوہ ایک دوسرے کی مذہبیات سے تشبیہات استعمال کرنا تو عام سی بات تھی، ہندو حضرات قرآن کی تلمیحات اور مسلم اہل قلم ہندوؤں کی قدیم حکایات کو اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اردو غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پریم[1] کی رمبھا[1] اربسی[2] ہنس ہنس — کلیاں نیہہ کی سب کھلاتے ہیں
مدن بان ساندے ہے پاکاں تھے چھندسوں — کہ جیوں ہرن پہ سرک زلف کھالی
(محمد قلی قطب شاہ)

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج
تپ کا مشتاق جی ہے لچھمن سوں
کشن سوں جب کہ نام نامی ہے
ولی تجھ زلف کی گر ساحری کا بیاں بولے
چلے پاتال سوں باسک[2] سو پیچ و تاب سوں اُٹھ کر
(ولی)

بحری کو دھن یوں ہے کہ جیوں نل کو دمن ہے — بس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جلنا
(بحری)

آتش عشق نے راون کو جلا کر مارا — گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی بیچ
(میر)

سانولے پن پہ غضب دھج ہے بسنتی شال کی — جی میں ہے کہہ بیٹھیے اب جے کنہیا لال کی
(انشا)

ایک ایک نقطے پر موے لڑتے ہیں مردوے — محفل مشاعروں کی اکھاڑہ ہے بھیم کا
(جان صاحب)

سانولے تن پہ قبا ہے جو تیرے بھاری ہے — لالہ کہتا ہے چمن میں یہ گردھاری ہے
(امانت)

ڈر کے میری شبِ جدائی سے — کالکا رام رام کرتی ہے
(امیر)

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی — ہوں مسلماں مگر بول اٹھوں جے کالی کی
(امیر)

محسن کاکوروی کی وہ نعت جس میں تمام ہندو تشبیہات استعمال کی گئی ہیں، اس قدر عام ہے کہ اس کا صرف ذکر کر دینا ہی کافی ہوگا۔

اسی طرح اردو کے ہندو شاعروں کو بھی الہیات سے استعارے تشبیہیں اخذ کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ قرآن، کلمہ، کعبہ، رسول، نوح، خضر اور جبرئیل، زکوٰۃ اور سورۂ اخلاص کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں جیسے یہ سب کچھ خود ان کے مذہب سے متعلق ہوں۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

یم اشکِ رواں میں ڈوبتا ہے مردم دیدہ — مدد یا خضر دوڑو نوح کی کشتی ہے طوفاں میں
(دوارکا پرشاد اُفق)

کعبے کی طرف نشہ میں کس طرح سے جاؤں — دشوار سنبھلنا ہے مجھے لغزش پا سے
(جانکی بی بی اہل)

بھلا نسبت ہے کیا ہندوستاں سے مصر و کنعاں کو
کہ یہاں ہر ہر گلی میں جلوہ یوسف نمایاں ہے
جو تیرے مصحف رُخ پہ لکھا یہ خطِ ریحاں ہے
پڑھا جاتا نہیں اک حرف بھی یہ کیسا قرآں ہے

———

کبھی نہ سجدہ کیا بدگماں نے میرے ساتھ
قیام اس نے کیا میں نے جب رکوع کیا
(دیبی پرشاد بشاش)

کرتے کرتے ذکر اُس کے مصحف رخسار کا — خود بخود مجھ کو کلام اللہ ازبر ہو گیا
(بال مکند بے صبر)

میں بھی رکھتا ہوں یونہی نامہ جاناں سر پر — جس طرح رکھتے ہیں مصحف کو مسلماں سر پر
(جواہر سنگھ جوہر)

صنم کے کعبہ رخ پر جو تل ہے چوم لے زاہد — کہ بوسہ سنگ اسود کا یہی فرض مسلماں ہے
(لالتا پرشاد شفق)

جب مصحف رخسار کا ہم کرتے ہیں — دمبدم سورۂ اخلاص کو دم کرتے ہیں
(رام سیوک برہمن شگرفی)

اسود کا ہو اتل یہ گماں اے فرحت — رخ کو کعبہ دہن یار کو زمزم سمجھے
(شنکر دیال فرحت)

صنم کا نہ لیں بے وضو کبھی — قرآں کا پاس چاہیے ہم پارسا کریں
(راجہ کشن کمار وفا)

تارا چند لاہوری نے ایک خمسہ شیوجی مہاراج کی صفت میں لکھا تھا، اس کا ایک شعر ہے:

جہاں میں دیوتا جتنے ہیں ان میں نامور شیو ہیں
سبھوں کے قبلہ و کعبہ اور سب کے پدر شیو ہیں

حق تو یہ ہے کہ تشبیہات اسلامی ہوں یا ہندوانہ، اردو شاعروں کے لگاتار استعمال سے زبان زد ہو چکی ہیں اور آج بھی برابر استعمال ہوتی ہیں۔

———

ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی، ایسے کئی مسلمان ولیوں اور مرشدوں کا ذکر کیا جائے گا جن کے پیروؤں میں ہندو بھی شامل ہوتے تھے، منشی کوڑے سنگھ صفی پچھلی صدی کے ایک ہندو شاعر تھے، صوفی شاہ نجم دین میرٹھی سے درسِ حقیقت لیتے تھے، ان کا ایک شعر ہے:

بفیضِ حضرتِ مرشد کہیے نجم دین ان کو — صفی طینت میں تیری پارسائی ہوتی جاتی ہے

———

اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا ایک رخ یہ ہے کہ دونوں مذہبوں کے شاعر ایک دوسرے کے پیغمبروں اور بزرگوں کا ذکر عجز و عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں، وہ پیغمبر اسلام اور کرشن، گوتم یا نانک کا دل سے احترام کرتے

ہیں۔ مرزا جان جاناں مظہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گیتا کو صحیفۂ مقدس سے کم نہیں سمجھتے تھے، اور ہندوؤں کو اہلِ کتاب کا درجہ دیتے تھے، یعنی مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، میل جول رکھنا، اور شادی بیاہ رچانا جائز تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا کرنا تعجب خیز بھی نہیں، کیونکہ یہ اس زمانے کی تہذیب کا رنگ تھا۔ نظیرا کبرآبادی جنم اشٹمی کے موقعہ پر برندابن اور متھرا جایا کرتے تھے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے ان میلوں کے نہایت دلکش مرقعے کھینچے ہیں۔ جھانکیوں کے جھانکنے تاکنے، کبت کتھا سننے، اور پالکیوں، ہاتھیوں، اور جوڑوں کے ذکر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظیر خود ان میلوں میں 'جے مہاراج رام رام بھجو' کا کیرتن کرنے والے جوگیوں میں شامل ہو جایا کرتے ہوں گے۔ نظیر کے ایک ایک شعر سے ان کی روح کی وہ پکار سنی جاسکتی ہے جو رام و رحیم یا کرشن و کریم کو ایک ہی ذات باری کا پرتو سمجھتی تھی۔

نظیر نے کرشن کی عقیدت سے سرشار ہو کر جو نظمیں لکھی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

جنم کنہیا جی، بالپن بنسری بجیا، لہو ولعب کنہیا، بانسری، کنہیا جی کی شادی، دسم کتھا، ہر کی تعریف میں، بیان سیکشن اور نرسی اوتار۔ نظیر کے پاکیزگی خلوص کے ثبوت میں صرف ایک شعر پیش کر دینا ہی کافی ہوگا۔ اپنے جوگی بھیا سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں:

گھنشام مراری گردھاری، بنواری سندر شیام برن
پربھوناتھ بہاری کان للا سکھدائی جگ کے دُکھ بھنجن

اس کے علاوہ کرشن کو انھوں نے ان مختلف ناموں سے پکارا ہے:

کانھ جھنڈولے، دودھ کے لٹیا، بدھ پوری کے بسیا، گون چریا، جوتی سروپ، مدن موہن، من ہرن، نندلال، گردھاری، گووردھن، نول کشور، ماکھن اچکے، گوبند چھیل کنج، بانسری بجیا، برج راج، مدن گوپال وغیرہ وغیرہ۔

ہندو مذہبیات میں شری کرشن کے متعلق شاید ہی ایسی کوئی حکایت ہو، جس کا نظیر کو علم نہ ہو۔ جمنا کنارے کی لیلا، رتھ کے جھلکتے ہوئے کلس کا اور دوار کا پوری کے موج میلوں کا ذکر نظیر جس اعتماد سے کرتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بھاگوت پران کی ایک ایک کتھا، قصے کہانیوں اور لوک روایتوں سے انھیں پوری واقفیت حاصل تھی۔

کنہیا کی راس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سکھیاں پھرے ہیں ایسی کہ جوں حور اور پری
سن سن کے اس ہجوم میں موہن کی بانسری

———

کرتے ہیں نرت کنج بہاری بصد برن
اور گھنگھروؤں کی سن کے صدائیں چھنن چھنن

———

حلقہ بنا کے کشن جو ناچیں ہیں ہاتھ جوڑ
پھرتے ہیں اس مزے سے کہ لیتے ہیں دل مروڑ

———

ناچیں ہیں اس بہار سے بن ٹھن کے نندلال
سر پر مکٹ براجے ہے پوشاک تن میں لال

———

ہے روپ کشن جی کا تو دیکھو عجب انوپ
اور ان کے ساتھ چمکے ہے سب گوپیوں کا روپ

———

خاطر نشان رہے کہ نظیر کی نظمیں تہذیبی نظمیں ہیں، ان میں ایک عجیب سرمستی، سرشاری اور وارفتگی کی کیفیت ہے اور کرشن بھگتی کی تہذیبی نشاط آفریں فضا ہے۔ یہ بیانیہ نظمیں اکثر و بیشتر لوک گیتوں کا سا لطف رکھتی ہیں:

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی کمٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

کرشن سے عقیدت کی اس روایت کو اردو کے مسلمان اہلِ قلم نے موجودہ زمانے تک قائم رکھا ہے۔ حسرت موہانی کا شمار کرشن کے سچے پرستاروں میں کیا جاسکتا ہے۔ کرشن سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے وہ ہندی شاعروں کا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تم بن کون سنے مہراج   راکھو بانھ گہے کی لاج
برج موہن جب سے من بسے   ہم بھولن سب کام کاج

———

نردئی شیام پردیس سدھارے   ہم دُکھیارن چھوڑ چھاڑ

———

من موہن شیام سے نینن لاگ   نسدن سلگ رہی تن آگ

———

کہاں چھائے رہے گردھاری   اورن مل سُدھ بھول ہماری

———

کوئی جتن جیا دھیر نہ دھارے   نیند نہ آوے نینن، گردھاری بنا

———

حسرت کرشن کے دلدادہ ہی نہیں بلکہ اُن کی محبت ہندستانیت کے اس جذبے کی ترجمان ہے جس کا راز کرشن کے کردار میں کھلتا ہے۔ حسرت کی ایک غزل کے چند اشعار کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا   دم بھرتی ہے آرزو اُسی کا
ہر ذرّہ سرزمینِ گوکل   دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانہ و نندگاؤں میں بھی   دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیات جاوداں تھا   ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت   سرچشمہ فروغِ آگہی کا

سیماب اکبرآبادی نے اپنی نظم 'تیرا انتظار' میں کرشن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کشش ہے برج کی یا جذب برج والے کا   خمیدہ ہیں شجر سایہ دار ایک طرف
طلوع ہو کہ درخشاں ہو مطلع متھرا   پہنچ رہی ہے نظر بار بار ایک طرف
نصیب کاش ہو سیماب کو بھی جلوہ تیرا   پڑا ہے وہ بھی سرِ رہ گزار ایک طرف

خواجہ حسن نظامی کو کرشن سے جو محبت و لگاؤ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں،

ان کی کتاب 'کرشن بانسری' مشہور ہے۔ ہمیں ان کا ایک مضمون دستیاب ہوا ہے جس میں انھوں نے کنس کا فرعون سے مقابلہ کرتے ہوئے کرشن کو موسیٰ کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔

غرض یہ کہ ایسے کئی مسلمان مصنفین اور شاعروں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جنھوں نے کرشن کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار نہایت احترام سے کیا ہے۔ مجموعی طور پر ایسے شاعروں کے چند اشعار کو دیکھ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو — کرشن کی بنسی کا ایک بہتا ہوا نغمہ ہے تو
(ساغر نظامی)

———

بنسی دھر اس بنسی کے پھر بول سنا دے متوالے
پھر برکھا رت گھر آئی ہے پھر بادل ہیں کالے کالے
(آغا شاعر قزلباش)

———

سری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں — اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
وہ جور و ظلم کی بنیاد ڈھانے آیا تھا — میں اُس کی رسم کو دنیا میں عام کرتا ہوں
(ظفر علی خاں)

———

متھرا تجھ سے ہے نامور بھگوان — بندرابن تجھ سے پُر اثر بھگوان
دل کی دنیا کا تو سویدا ہے — گھر خدا کا ہے تیرا گھر بھگوان
(نواب سراج الدین خاں سائل)

———

چارہ سازی کیجیے مرلی منوہر آپ ہی — سینۂ بسمل کا اک اک زخم کاری دیکھیے
(بسمل الہٰ آبادی)

———

تصویر اس سانولی صورت کی کھچ آئی دل کے شیشے پر
اب تو اپنے من موہن کو میں آئینہ دکھلاتا ہوں
(ابن الحسن فکر)

———

کاش پھر تاریخ الٹ دیتی ذرا اپنے ورق
کاش ہم پھر معرفت کے تجھ سے سن سکتے سبق
(سعید احمد سعید)

اس کے علاوہ کرشن کے مسلمان مداحوں میں حفیظ جالندھری، ابن حسن قیصر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، مظہر علی، منظر صدیقی ابنِ سیماب، عشرت رحمانی، مظفر حسن دائرہ شارفی، محمد امین شرقپوری اور محمد عباس حسن کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے مسلمان اہلِ قلم کرشن کی طرح ہندوؤں کے دیگر مذہبی اکابرین کا بھی احترام کرتے ہیں: نظیر اکبر آبادی نے گرو نانک کی مدح ان الفاظ میں کی ہے:

جو لطف و عنایت ان میں ہیں کب وصف کسی سے ان کا ہو
وہ لطف و کرم جو کرتے ہیں ہر چار طرف ہیں ظاہر وہ

———

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

علامہ اقبال بھی نانک کی عظمت کے معتقد تھے:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

گوتم اور رام کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں — شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

———

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا — پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

ہندوؤں کی کئی مذہبی کتب کے تراجم بھی مسلمانوں کے مرہون منت ہیں۔ ان میں خواجہ دل محمد کی گیتا اور سکھ منی صاحب ہندوؤں میں بہت ہی مقبول ہیں۔ اثر لکھنوی نے بھگوت گیتا کو نظم کیا ہے۔ نفیس خلیلی نے بھی گیتا کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ غلام الحسنین کے ہندو مذہب پر دیے گئے لکچروں کا مجموعہ 'ہندو مذہبی معلومات' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور اجمل خاں صاحب کے اسمائے گرامی بھی اس زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک مذہبیات کا تعلق ہے، اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا یہ ایک رخ تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسی گرم جوشی سے مسلمانوں کے جذبات کا جواب دیا ہے۔

منشی کنہیا لال شاد نے جو انیسویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتے ہیں، ایک رسالہ علم تصوف پر تالیف کیا تھا۔ لکھنؤ کے منشی بھیروں پرشاد وکیل اور منشی اودھ بہاری لال ثمر نے ایک کتاب 'منتخبات مناجات' کو مرتب کیا تھا۔ منشی پریم چند کا ناول کربلا اور گوردت سنگھ دارا کی کتاب 'محمد کی سرکار' بھی اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

سرور جہاں آبادی کی نعت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کیفی نے لکھا ہے کہ وہ مولود شریف کے جلسوں میں پڑھی جاتی ہے۔

منور لکھنوی نے قرآنِ پاک کے کچھ حصص کو اردو نظم میں منتقل کیا ہے۔ یہ حصے رسالہ ادب کراچی میں چھپ چکے ہیں۔

منشی روپ چند نامی تلمیذ ساقی سکندر آبادی کا ذکر کرتے ہوئے عشرت لکھنوی نے لکھا ہے (1) کہ ان کی غزلوں میں ایک شعر نعتیہ ضرور ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ شعر درج کیا گیا ہے:

آیا جو نام پاک محمد زبان پر — صلّی علیٰ کا شور ہوا آسمان پر

اردو کے ہندو شاعروں میں ان گنت ایسے کئی نام پیش کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے پیشوائے اسلام کی بارگاہ میں زانو عقیدت تہہ کیا ہے۔ ان میں ہرگوپال تفتہ، بندرابن عاصی، بال مکند بے صبر، دلو رام کوثر اور شیو پرشاد وہبی کے نام قابل

ذکر ہیں۔ (2)

اردو ادب میں ہندو شاعروں سے منسوب جو نعتیہ کلام موجود ہے اس بات کا شاہد ہے کہ اردو کے ہندو ادیب ہندو ہوتے ہوئے بھی 'قائل اسلام' ہیں۔ یگانگت اور اتحاد پسندی کی اس سے بڑی اور کیا دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ منور لکھنوی حضرت محمدؐ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

آپ پر نازل خدائے پاک نے قرآں کیا
سرمۂ توحید سے وا دیدۂ عرفاں کیا
آشکار ازندگی کا جوہر پنہاں کیا
پیکر اقدس کو رشک کعبۂ ایماں کیا
جو نہ سمجھیں آپ کا رتبہ وہ اہلِ دل نہیں
اور کوئی جادۂ تسلیم کی منزل نہیں

شیر خدا حضرت علیؓ کی صداقت اور تقدس کا اعتراف انھوں نے یوں کیا ہے:

ایسا مطیع اہل کلام اور کون تھا
ایسا شہ عرب کا غلام اور کون تھا
فرش زمیں پہ عرش مقام اور کون تھا
تسبیح مصطفےٰ کا امام اور کون تھا
پیدا دلاوری سے تھی صدق وصفا کی شان
شیرِ خدا کی شان تھی شیر خدا کی شان

———

لیکن اس سلسلے میں ہندو ادیبوں کا اہم کام وہ مرثیے اور سلام ہیں جو انھوں نے شہیدانِ کربلا کی نوحہ گری میں لکھے ہیں۔ دکنی شاعر رام راؤ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ اولیں ہندو شاعر ہے جس نے شہادت امام حسینؓ پر ایک کتاب قلمبند کی تھی جو آج ناپید ہے۔ لکھنؤ میں مرثیے کی ابتدا ایک ہندو شاعر چھنو لال تخلص طرب سے ہوئی جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور دلگیر تخلص کرتے تھے۔ اردو کے جن قدیم ہندو شاعروں نے مرثیے اور سلام لکھے ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ منشی دوارکا پرشاد افق، چھنو لال طرب، گردھاری پرشاد باقی، سرکشن پرشاد شاد، پیارے لال رونق، چھیدی پرشاد شیدا اور راجا الفت رائے الفت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تاج بہادر غریب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ عشرہ محرم میں تعزیہ رکھتے تھے اور لالہ خدا بخش کہلواتے تھے۔ ان کے والد منشی عالم چند بھی امام حسینؓ کے شیدائی تھے اور اسی رعایت سے لالہ حسین بخش پکارے جاتے تھے۔

عہد حاضر کے جن ہندو شاعروں نے مرثیے اور سلام کہے ہیں، یہاں ان میں سے چند کا ذکر اجمالاً کیا جاتا ہے:

نانک چند نانک شاگرد پیارے صاحب رشید بھی مرثیہ کہتے ہیں۔ ان کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ شیعہ حضرات ان کو منبر پر بٹھا کے مرثیہ پڑھواتے تھے۔

گوپی ناتھ امن بھی شیعہ حضرات کی طرح محرم کو پورے احترام کے ساتھ مناتے ہیں، ان کی نظم 'حسینؓ' کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

رنگ بدلیں ہندو و مسلم وطن میں کتنے ہی
امن کو رہنا ہے آخر تک پرستار حسینؓ

حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں اردو کے ہندو شاعر اپنی عقیدت کو یوں پیش کرتے ہیں:

اُف رے قربانی عظیم اس کی
مرد میدانِ کربلا کو سلام
بندگی جس پہ ناز کرتی ہے
دل سے اس بندۂ خدا کو سلام
(منور)

فطرت کی مصلحت کا اشارہ حسینؓ تھا
قربانیوں کی آنکھ کا تارا حسینؓ تھا

وہ اس لیے مٹا کہ ستم کو مٹا سکے
پھر کیوں نہ یہ کہوں کہ ہمارا حسینؓ تھا
(قمر جلال آبادی)

ہندوؤں کے اس جذبۂ غم کی بنیاد انسانیت کے وسیع تر مفہوم پر ہے:

غیر مسلم ہیں شریکِ غم مسلمانوں کے ساتھ
آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ
(کرشن گوپال مغموم)

حق وصداقت مرا مسلک ساحر
ہندو بھی ہوں شبیرؓ کا شیدائی بھی
(رام پرکاش ساحر)

کافر کوئی کہے تو کہے امن کو مگر
اس کے دل وجگر میں قیام حسینؓ ہے
(گوپی ناتھ امن)

آتی ہے بام عرش سے لب پر مرے صدا
دل سے جگر بھی آل نبیؐ کا غلام ہے
(رام نرائن جگر)

یہ کفر سے بدتر ہے اگر اے منصور
اس زندۂ جاوید کا ماتم نہ کروں
(گیان چند منصور)

حضرت امام حسینؓ کا پیغام صرف مسلمانوں یا ہندوؤں کے لیے نہیں، وہ جہاں بھر کے لیے ہے اور ہر انسان کے لیے اس کی تعظیم واجب ہے:

تخصیص نہ ہندو کی نہ مسلم کی ہے اس میں
شبیرؓ کا پیغام جہاں بھر کے لیے ہے
(دگمبر پرشاد گوہر)

درس آموز جہاں ہے اب بھی تعلیم حسینؓ
سب کریں جامِ شہادت پی کے تعظیمِ حسینؓ
(کرشن گوپال مغموم)

شیش چندر طالب دہلوی نے ایک کتاب 'ہمارے حسین' مرتب کی ہے۔ یہ کتاب محرم 1945 میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کو پیش کی گئی تھی۔ اس میں موجودہ ہندو شاعروں کے کہے ہوئے مرثیے اور سلام یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اوپر جن شاعروں کا ذکر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ اس کتاب میں جن شاعروں کا کلام درج ہے، ان کے نام یہ ہیں: جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، راجندر ناتھ شیدا، ضیا فتح آبادی، نرائن داس طالب، گرسرن لال ادیب، پریم چند پریم، چند بہاری لال ماتھر صبا، جگدیش سہائے سکسینہ، گلشن جلال آبادی، شنکر سروپ مفتوں، شگن چند روشن، امر چند قیس، بلونت کمار ساگر، رام پرتاپ اکمل اور رام لال ورما۔ ●●

(باقی دوسری قسط میں)

(نوائے ادب، بمبئی، جنوری 1955)

تفتیش

رفیق راز

کیوں نہیں بتا رہا کہاں سے کیا چرایا ہے
آنکھ کھول کے دکھا کہ اس میں کیا چھپایا ہے

آنکھ میں تری جو عکس ہیں وہ کچھ عجیب ہیں
ٹھیک سے بتا کہ تو کہاں سے ہوکے آیا ہے

آنکھ دل دماغ ہیں شریک تیرے جرم میں
سنتے ہیں کہ شاعری کا شوق بھی چرایا ہے

وہ ورق پہ اس طرف شرر ہیں کیسے راکھ میں
کیا یہ اپنی سوچ کو حروف میں چھپایا ہے

شاعری کے واسطے مواد چاہئے جو تھا
وہ مواد بھی بتا کہاں کہاں سے آیا ہے

شہر والے چوک سے صدا وغیرہ لائی ہے
اور کچھ سکوت میں نے مقبروں سے لایا ہے

اب بتا یہ داغ کیا چمک رہا ہے سینے میں
یہ جناب کاروبار عشق میں کمایا ہے

اور یہ جبیں کا داغ آفتاب سا ہے جو
خود نہیں پتہ مجھے کہ یہ کہاں سے آیا ہے

کون ہے یہ شخص دوسرا جو تیرے ساتھ ہے
میں اکیلا ہوں جناب یہ تو میرا سایا ہے

کارنامہ زندگی کا اور بھی کوئی ہے کیا
چوری کے علاوہ کچھ کمال کر دکھایا ہے

بارہا جناب سطحِ آب پر چلا ہوں میں
اور پاؤں کے نقوش تک کو بھی بچایا ہے

تم یہ کس جہاں کا ذکر شاعری میں کرتے ہو
صفحۂ بیاض پر یہ کیسا گل کھلایا ہے

تم نے سبزہ باغ کا کیا نہ صرف پائمال
بلکہ اک درخت کا تو ایک پھل بھی کھایا ہے

یہ جو چاند گھٹ رہا ہے آسماں پہ دن بدن
جانچ کرکے ہاتھ اس میں ہم نے تیرا پایا ہے

تو نے بیٹھنے دیا نہ آسماں کو چین سے
اور اس زمین پر فساد بھی اٹھایا ہے

تیری شاعری میں خوں کا ذکر کیوں زیادہ ہے
کیوں ہر ایک شے کو تم نے سرخ ہی بتایا ہے

پڑ گئے ہیں دیکھ اس فلک پہ بھی شگاف کچھ
تو نے اس قدر زمیں پہ شور کیوں مچایا ہے

جس جہاں کا ذکر میری شاعری میں ہے بہت
اس کو میں نے جسم کی حدود میں ہی پایا ہے

آگ لگ گئی تھی اور اسی سے یہ دھواں اٹھا
میں نے یہ کوئی سیہ علم نہیں اٹھایا ہے

میری کیا مجال پھل کو ہاتھ بھی لگاؤں میں
شاخ کو حضور یہ پرندے نے ہلایا ہے

میری کیا خطا اگر جہاں میں نقص بھی ہیں کچھ
کیا جہاں کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے

ذہن سوچ سوچ کے مرا جواب دے گیا
آپ نے سوال پوچھ پوچھ کے ستایا ہے

ہاں یہاں کی یہ ہوا بھی میں نے ہی خراب کی
ہاں یہ سچ ہے اس میں زہر میں نے ہی ملایا ہے

ہاں تمام تر مصیبتوں کی جڑ بھی میں ہی ہوں
ہاں جو حشر ہے بپا وہ میں نے ہی اٹھایا ہے

میں نے اک چراغ کیا جلایا شور مچ گیا
آپ نے جناب بستیوں ہی کو جلایا ہے

اب جو شہر نذر سیل تند ہونے والا ہے
میری کیا خطا مجھے تمہیں نے تو رلایا ہے

تو نے جو تماشہ یہ لگا رکھا ہے بند کر
ہم نے تجھ پہ ہاتھ تبھی ابھی نہیں اٹھایا ہے

منہ کو اب لگام دے بہت ہوا جواب دے
ٹھیک سے سوال سن یہ شور کیا مچایا ہے

تو قبول کر چکا ہوا میں زہر تیرا ہے
زہر کے علاوہ اس میں اور کیا ملایا ہے

لوگ مر رہے ہیں روز دیکھتا نہیں ہے تو
سچ بتا ہوا میں زہر تو نے کیوں ملایا ہے

●●

غزل

رفیق راز

خامشی کیا صدا ہے وسعت کی
ہم نے تو دشت میں سماعت کی

ہوکے روشن گھنے اندھیرے میں
شیر کی آنکھ نے حماقت کی

سی لئے ہم نے ہونٹ ہی اپنے
اپنے نکتہ کی یوں وضاحت کی

سر پہ میرے کبھی نہ ٹوٹی جو
وہ قیامت بھی تھی قیامت کی

منزلوں کو مری بشارت دی
اور مجھ کو خبر مسافت کی

جو نہ آئی کبھی نہ آئے گی
بس وہی اک گھڑی تھی راحت کی

اس مکاں کو ابھی ضرورت ہے
در و دیوار کی اور اک چھت کی

غزلیات

رفیق راز

اور تو کیا تھا زاد سفر شب گیروں کا
بس اک نقشہ نامعلوم جزیروں کا

راتوں رات اسیروں کو لٹکانا پڑا
بند نہیں ہوتا تھا منہ زنجیروں کا

ماتھے پر وہ داغ ادھر ہیں سجدوں کے
جال ادھر ہے ہاتھ پہ میرے لکیروں کا

ان سنسان سی سڑکوں پر اڑتی ہے خاک
جن پر دریا بہتا تھا رہگیروں کا

تیری یاد کا رشتہ وہی ہے اب دل سے
جو دیوار سے ہوتا ہے تصویروں کا

قہر خدا سے بستی تھی محفوظ مری
فیض تھا جاری شب بیدار فقیروں کا

میری بات نہیں میری اوقات ہے کیا
شہر سخن میں حال خراب ہے میروں کا

دل میں تو سرکشی کا مرے تب خیال تھا
جب سجدے سے بھی سر کو اٹھانا محال تھا

کاغذ پہ جو بھی حرف تھا دیمک کا رزق تھا
صد شکر ہے میں حرف نہیں تھا خیال تھا

زہریلی تھی ہوا ہی تو مرنا تھا کیا کمال
اس شہر میں تو سانس ہی لینا کمال تھا

درباری خالی تخت کے آگے تھے سب کھڑے
اور تخت پر لکھا ہوا ،قحط الرجال، تھا

میں ان دنوں تو خود سے بھی تھا کچھ کٹا ہوا
لیکن فلک سے رابطہ میرا بحال تھا

پانی پہ چل کے چھوڑ گیا پاؤں کے نشاں
تیراک تو نہیں تھا مگر باکمال تھا

مجھ کو طلوع ہونے کا تب حکم مل گیا
دنیا میں جب عروج پہ وقت زوال تھا

اس کی زباں خموشی تھی لہجہ تھا عطر بیز
اس شور و شر میں اک وہی شیریں مقال تھا

غزلیات

رفیق راز

سماعت کے در پر صدا سوگئی
کہاں جاکے میری دعا سوگئی

نبرد آزما آنکھ منظر سے ہے
مری جاں یہ کس نے کہا سو گئی

جگاتی تھی دشت و بیاباں کو جو
گلی میں وہ آواز پا سو گئی

جہاں بھر کے خوابوں نے حملہ کیا
وہ جاگی ہوئی آنکھ کیا سو گئی

بجھی آگ تو راکھ کے ڈھیر پر
بہت رقص کرکے ہوا سوگئی

لئے آنکھ میں اک امید سحر
وہ بڑھیا بجھا کر دیا سو گئی

مسافر تو تھا میں ہی بس آخری
مرے بعد راہ وفا سو گئی

جو دل میں تھے انگارے وہ بجھ گئے
کہ تیری ہی اپنی انا سو گئی

زبان خلق خدا بند تھی عدالت میں
خموشی بول رہی تھی مری حمایت میں

دبوچ لی گئی سرحد عبور کرتے ہوئے
لیا گیا ہے صبا کو بھی اب حراست میں

میں نا بلد نہیں آداب وصل سے لیکن
بگڑ گیا ہوں میں تنہائیوں کی صحبت میں

ہوائے تیز پہ طاری جمود ہوگیا ہے
گئی ہے کام سے یہ خاک کی محبت میں

نہ کر سکوت کو اپنے ابھی سپرد صدا
خراب ہوتے ہیں سارے ہی کام عجلت میں

گزر چکی تھی اب آندھی مکاں گرے ہوئے تھے
شجر جھکے ہوئے مشغول تھے عبادت میں

ابھی میں حرف ادق سے کہاں نکل پایا
بھٹک رہا ہوں اسی دشت لا نہایت میں

رفیق راز۔۔۔۔۔۔نہر شرر کا ساربان

محمد یوسف ٹینگ

تقریباً دو صدیوں سے کشمیر اور اردو دو عاشقوں کی طرح رومان انگیز رنگ رلیوں میں مشغول ہیں۔کبھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے اور کبھی ایک دوسرے کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے۔اس دوران اس خوبصورت سرزمیں پر بڑے بڑے ادبی آشفتہ سر اس عشوقہ طراز حسینہ کو پٹانے کی اپنی سی کرتے رہے۔لیکن ہماری ادبی تاریخ گواہ ہے انہیں ایسا کرنے بعد خدائے سخن میر تقی میر کے اس شعر سے ہی اپنے آپ کو تسلی دینا پڑی۔۔۔:؛

ساعد سیمیں اس کے دونوں ہاتھ میں لا کر چھوڑ دئے

بھولے اس کے قول وقسم پر ہائے خیال خام کیا

مگر پچھلی صدی کے جاتے جاتے رفیق راز کی پیشوائی میں چند نئے ہم نواوں کی آمد کے بعد صورت بدل گئی اور یہ نو وارد اردو سخن سرائی کے قلب میں خیمہ ذن ہو گئے۔اس میں کچھ تو ان سخن وروں کے اپنے کسب وکمال کا ہاتھ تھا اور کچھ اردو کی اپنی کربلا کی کارفرمائی تھی یا اس زبان کو درہ ءخیبر کی طرف دھکیلنے کی کوششیں تھیں جو قائم چاندپوری کے الفاظ میں ریختہ ءدکن تھی۔بہر حال تنگئی اوراق کی معذرت کے ساتھ بات رفیق راز سے ہی شروع کرتے ہیں۔اس کا زیر نظر مجموعہ کلام اردو کے عصری مزاج اور موسم کی ایسی ہی برجستہ اور شگفتہ جھاڑی لگتا ہے جیسی اردو کے دوسرے چمن زاروں مثلاً دلی حیدرآباد بمبئی الہ آباد لاہور وغیرہ میں اپنے پھولوں اور کانٹوں کے ساتھ لہلہارہی ہیں۔رفیق راز کے اس نزول کی چاپ ہم نے پہلے پہل شمس الرحمان فاروقی کے عہد آفریں مگر جواں مرگ جریدے (شب خوں) کے روایت سوز صفحات پر سنی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ اردو شعر وادب ذوق اور ذائقے کی دھار بدلنے والے اس رسالے میں رفیق راز سب سے زیادہ چھپنے والا کشمیری ہے۔(شب خوں کے یہ اوراق اتنے نادرالحصول تھے ہمارے کچھ ایسے اردو گوان اپنا نام دیکھنے کی حسرت میں آہیں ہی بھرتے رہے، جن کے ساتھ بہتیرے مجموعوں کی چنگیری لٹکی ہوئی ہے۔

ناقدوں نے ادبی نثر کو چلنے پھرنے (walking) اور نظم کو رقص کرنے سے تشبیہہ دی ہے۔رفیق راز کی اس کتاب میں اس رقص آسائی کے بہت وطیرے اور پینیترے نظر آتے ہیں۔کبھی کسی نازنیں کی اداوں کے کرشمے اور کبھی کسی تانڈو کی ہیبت انگیزی۔موسیقی ریزی شاعری کی رگ رگ میں بستی ہے لیکن یہ ایسا جام جہاں نما بھی ہوتی ہے جس میں تفصیل اور تشریح کے گرد وغبار سے زیادہ تواریخ کی روح کا عطر ٹپکتا رہتا ہے۔رفیق راز کے کشمیر کے کچھ نقوش اور صدایئں سنتے چلیں تو اس رمز کے کنائے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔۔۔۔

یہ ٹوٹے پھوٹے گھر ہیں کہ تحریر وقت کی

یہ شہر ہے کہ کوئی نوشتہ عذاب کا

بھرتا ہوں آہ سرد لرزتا ہے کوہسار

دھنتا ہے سر کو طاق پہ افسردہ سا چراغ

فلک سے اترا ہوا یہ کوئی عذاب نہ تھا

چھپا تھا زلزلہ دیوار ودر کے اندر ہی

لیکن شاعر زمانی اور زمینی ہونے کے ساتھ ساتھ ماورائی اور ماسوائی بھی ہوتا ہے۔سچی شاعری میں جو امیجری اور تصویر نمائی ملتی ہے اس کے نقوش خواب کی تجریدی دنیا ہی سے مستعار ہوتے ہیں۔مرزا غالب کا بھی یہی خیال تھا۔

نہیں ہے کیا کوئی ایسا جہان میں غالب

جو جاگتے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

اس کتاب کا شاعر بھی اپنے خوابوں میں اسی صحرائے نجد کا باشندہ ہے جسکا اندازہ اس کتاب میں صحرا کے بار بار ذکر اور صرصر کی تکرار سے ہوگا۔اس کے دشت ذات کی نرالی اور خاص صفاتی ترتیب ہے۔وہ طوفان گرد وغبار میں عجیب خدو خال دیکھتا ہے۔اسی لئے اس کے یہاں الگ تھلگ لفظ کا وجود تلاش ہی سے ملتا ہے کہ وہ لفظ کی آمریت سے مرعوب نہیں ہوتا،اس کے یہاں پیکروں لے جلوس اور پہنائیوں کے چراغاں نظر آتے ہیں جن میں ماضی حال اور مستقبل اپنے صیغے بھول کر ایک بڑے تہذیبی کینوس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

معنی ہوں پر قیام نہیں لفظ میں مرا

باشندہ ہی نہیں ہوں میں ملک کتاب کا

ڈوب جاتا ہے جو اس میں وہ ابھرتا ہے کہاں

بے صدا حرف میں پاتال کی گہرائی ہے

خاک بدن کو صرصر سفاک چاہئے

اڑتی نہیں یہ خاک صبا کے خرام سے

نہر کوثر ریت میں ہے نار دوزخ آب میں

دشت میرے پیچھے ہے دریا ہے میرے سامنے

معاصر کشمیر میں حسن وعشق کی سرگوشیاں شب گزیدہ لحافوں سے باہر آ کر کوچہ و بازار میں دھوم مچاتی نظر آتی ہے۔اس میں کچھ تو ماڈرنزم کے کسب وکمال کا ہاتھ ہے لیکن بنیادی طور یہ ایک دبے ہوئے جذبے کی شورانگیزی ہے۔سکا گراف بہر حال نیچے آجائے گا۔رفیق راز گہری نظر اور دھیمے لہجے کا سخن گو ہے۔اس نے اس ہنگامے میں جو خاص زاوئے دریافت کئے ہیں ان میں رومان انگیزی سے زیادہ ستم ظریفی کی کارفرمائی ملتی ہے۔شاعر حسن جوئی میں جسم یار کو خود جمالیاتی انبساط میں حائل دیوار قرار دیتا ہے۔یہ ایک دانشور کی حسیت کا اظہار ہے جس میں لمسی کیفیات سے زیادہ ذہنی ارتعاشات سے حظ حاصل ہوتا ہے۔کبھی کبھی ایسے شاعر اپنی معنی آفرینیوں سے ہی رنگینیاں خلق کرتے ہیں۔یہ وہ صورت ہے جس کی طرف ٹی۔ایس۔ایلیٹ

نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم کسی معشوق سے ملتے ہیں تو دوسری بار وہی بالکل ایک اجنبی کی طرح ذات دیگر لگتا ہے۔۔۔

گیسو دراز اور وہ آنکھیں عقیق سی
پھرتا ہے روز وہ لئے کیا رات کیا چراغ۔۔۔۔۔

سونا پڑا ہے شہر بدن کوئی راہرو
اک آگ لمس کی لئے صحرائے جاں سے آئے۔

کیا کروں تیرے بدن کی تعریف
شعلہ اک کاغذی پوشاک میں ہے

ہر سمت ایک دبدبہء روشنی ہے آج
ہے وصل کی یہ رات بھی کتنی قمر زدہ

شاعر کی ایک بڑی آزمایئش اس وقت ہوتی ہے جب وہ مانوس اور پامال لہجوں کی دلدل سے نکل کر انہی الفاظ میں نئی روشنی تلاش کرنا چاہتا ہے، جو معنی کی ہم رنگی اور تہہ نشینی کے باوجود تازہ مہک پیدا کرسکیں، اوران سے نئی راگنیوں کے سرا بلنے لگیں۔ایسے لمحات میں خیال زندہ ہوکر سانس لینے لگتے ہیں۔اور لفظ انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں۔ یہ دراصل شاعر کی اپنے میڈیم پر مکمل قدرت اور نصرت کی آیئنہ داری ہوتی ہے۔رفیق راز اس کسوٹی پر سچا نکلتا ہے۔۔

ہزاروں چشمے تڑپتے ہیں ان کے سینوں میں
چٹانیں رکھتی نہیں ہیں مگر لب اظہار

میں ایک فعل مسلسل تو اسم اعظم ہے
ہمارے بیچ میں حائل ہے ایک حرف جار

دوڑتا جس کوہ کی رگ رگ میں ہے میرا سکوت
میری ہی آواز سے اک دن فنا ہوجائے گا

ڈالتا ہوں روز اس میں نیکیاں دو چار میں
صورت کشکول یہ دنیا ہے میرے سامنے

گلوئے خشک سے تقریر کررہا ہے کوئی
تڑپ رہا ہے زمیں دوز کوئی چشمہ بھی

رفیق راز اردو اور کشمیری کا نثر نگار ہونے کے علاوہ کشمیری شعر و ادب کا شناسا اور شناور بھی ہے۔اس بڑے شعری ایوان کی کچھ صدایئں شاید اسکی اجابت کے بغیر اس کے کلام میں اردو کی پوشاک زیب تن کر کے جستہ جستہ دندنانے لگتی ہیں۔صرف چند نمونے۔۔۔

ناو در آب تے آب در ناو
(کشتی پانی میں ہے اور پانی کشتی میں)

سوچھ کرال۔۔۔۔

پانی میں سفینہ ہے سفینے میں ہے پانی
ہے آب فقط آب سر آب تہہ آب۔

رفیق راز

چھے کرنا زنیں کانسہ سیود روئے ہاواں
توے آبہ منز زون الان ٹاٹھ یار ومہجور (خوبان اپنا روئے زیبا کب دکھایا کرتے ہیں جبھی تو چاند کا عکس پانی میں بھی لرزتا ہے)

لایا ہے مجھے منظر مہتاب تہہ آب
دیکھا تو ملا کچھ نہیں جز آب تہہ آب

رفیق راز

یہ صرف ایک غزل سے چنے گئے ہیں۔فرصت سے ایسی سعی کی جائے تو اور بھی مثالیں ملیں گی۔کشمیر کے کلاسیکی شعرا پر ہی کیا موقوف مرزا غالب کی یہ بازگشت بھی دیکھئے

کہاں سے آتے ہی لعل و گہر خیال کے ہر روز
دبا ہوا تو نہیں میری خاک ہی میں بدخشاں

رفیق راز

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

غالب

رفیق راز اردو دنیا کا جانا پہچانا ہی نہیں مقبول و مستند نام ہے۔اس کا پہلا مجموعہء کلام (انہار) تقریباً دس سال پہلے شایع ہوکر اسکی شعری بصیرت کا ڈنکا بجا چکا ہے۔پانچ سال قبل شایع ہونے والا اس کا دوسرا مجموعہ (مشراق) ابھی تک داد و تحسین وصول کررہا ہے۔شعر سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے۔اردو کے سمٹتے ہوئے دایئرے میں وہ بہت معروف ہے۔کشمیری اردو دوستوں کے لئے یہ بات افتخار اور اعتبار کی ہے کہ اردو شعر کے (highland) پر ہمارا ایک سخن گو پوری آن بان سے جلوہ گر ہے۔

اور اس کے ساتھ اس کے چند ہم نوا کشمیریوں کی بدولت اب دبستان دلی دبستان لکھنو وغیرہ کی تمیز مٹ جانے کے بعد ہمارے شاعر ایک ہموار زمیں پر نغمہ سرا ہیں۔اور کشمیر کی اردو سرائی کی روایت کو معتبر اور مستحکم بنا رہے ہیں۔

رفیق راز کا ایک اور گہرا شغف عروضیات اور اس سے وابستہ معاملات کے ساتھ ہے۔اس موضوع پر اسکی کتاب بھی شایع ہوکر اپنا معیار منوا چکی ہے۔خود اس کی منظومات میں بندش کی چستی اور ردیف وقافیہ کی ندرت اس کی استادی کی شہادت پیش کرتی ہیں۔اس کے کلام سے ڈھونڈے سے بھی کوئی جھول کوئی ڈھیل نظر نہیں آتی۔البتہ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس کے اشعار میں مضامیں کی ہی نہیں استعارات ،محاکات وغیرہ کی تکرار بھی کچھ زیادہ ہی گونجتی ہے۔شاید کچھ ایسے اشعار بھی اس قصر سخن میں ہیں جنہیں انتخاب کی بے لاگ چھلنی دکھا کر الگ کیا جاسکتا تھا۔لیکن اقبال فیض اور فراز جیسے بڑے شاعر بھی اس کے ارتکاب سے نہ بچ سکے تو رفیق راز کے یہاں بھی اس کا جواز مل جایئگا۔ بلکہ میں تو اپنے آپ کو اس کی اس تعلیٰ پر سر دھننے سے باز نہیں رکھ سکتا۔۔۔۔

ہے میری غزل سرو چراغان مضامیں
دیواں ہے مرا گرمیء اظہار سے روشن ●●

سرسبز

مدیر: کرشن کمار طور

9816020854

نظمیں

علی محمد فرشی

لاغری

ڈولتی ہوئی زمین
کب تلک سنبھالے گی
بوجھ آسمان کا!

زندگی کی اُترن

کھیت میں کپاس کے
چُن رہی تھیں لڑکیاں
پھول تھے کہ خواب تھے!

خواب کا بوجھ

رات بے دھیانی میں
کھینچ کر پرے کر دی
آسمان کی چادر!

مشغلہ

ہر شام
اُفق پر وہ
اک خون بھری گاگر
انڈیل کے
ہنستی ہہہہہہ ہے!

اندھی اُمید

آنسوؤں کے ساون میں
آفتاب ٹپکیں گے
تار تار دامن میں!

زندگی کا اِنتظار

اُس کے لمبے بالوں میں
ایک پھول نرگس کا
مہکا سولہ سالوں میں

مردہ صبح

برف کے پہاڑ پر
رات بھر پڑی رہی
لاش آفتاب کی

بے مہار زندگی

اُس کی گرم سانسوں میں
ایک تیز جھونکا تھا
بے قرار خوشبو کا

کھلنڈری

شام کے کنارے پر
اُس نے خون پھینکا تھا
اور میں نے
ایک خواب!

کہتے ہیں

پہاڑوں پر
گری
برفوں کے دکھ
دریا میں بہتے ہیں
سمندر پیاسے رہتے ہیں!

پرانی کہانی

ندامت کے بستر پہ بیٹھے ہوئے
اُس نے سوچا
کہانی میں
جس مرد کا ذکر تھا
یہ وہی تو نہیں!

گیلی راکھ

اُس کی سرخ آنکھوں میں
روشنی کی بارش تھی
یا کہ
خواب جلتے تھے!

نحوست

مکڑی ماری تھی
اس کے بعد تو
تنہا رات
اور بھی بھاری تھی

گمانیہ

میں سایہ ہوں
آگے آگے جانے والی عورت کا
یا پھر
پیچھے پیچھے آنے والی عورت کا!

سرگوشی

ریت پر
بکھرے ہوئے
اک دریدہ بادباں سے
لہر نے آ کر کہا
کیوں، ہوا کی دوستی کیسی رہی!

اجنبی تعبیر

زرد پھول سرسوں کے
دووور
دووووووور
کھیتوں میں
وعدے مہکے برسوں کے

اندھی

بدحواس رات نے
میرے ننھے خواب پر
اپنا پاؤں رکھ دیا!

بوڑھا موسم

ننگی خواہش
آتش دان کے آگے بیٹھی
کانپ رہی ہے
اور دسمبر
اک خالی تابوت میں،
سونے چلا ہے!

موت

اندھی لڑکی
میرا پیچھا کرتی ہے
بنجر موسم سے برساتوں تک
بے خوابی سے خوابوں اور کتابوں تک
نظموں سے لبریز مہکتی راتوں تک!

موٹا حرامی☆

شبنم روتی ہے
ہر شب ہیروشیما کی
برسی ہوتی ہے

☆FAT MAN

چھوٹا حرامی☆

ناگاساکی ہے
راکھ ابھی تک خوابوں کی
دل میں باقی ہے

☆LITTLE BOY

اعادہ

کسی دن
سبز آنکھوں کے
گھنے جنگل میں جانا ہے
پرندوں کو جگانا ہے
نیا سورج اُڑانا ہے

گمشدہ

فلک سے
اُترتی ہوئی سیڑھیوں پر
زمین ایسی حیران لڑکی کی مانند
اکیلی کھڑی ہے
اچانک جسے
اپنا گھر بھول جائے!

شاعر

آنسو بونے والا
نظمیں کاٹ رہا ہے

آگہی کی سزا

وقت سے پہلے
خود کو پورا دیکھنے والے
اندھے ہو جاتے ہیں!

●●

معاصر تنقیدی رویے

ابوالکلام قاسمی

صفحات: ۲۸۰

قیمت: ۱۲۵ روپے

سن اشاعت: ۲۰۱۹

ناشر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مغربی بنگال کی ادبی صحافت: ماضی و حال

عبدالحی

ہندوستان میں اردو کا سب سے پہلا اخبار جامِ جہاں نما ہے جو 27 مارچ 1822 سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس اخبار کے لیے درخواست دینے والے ہری ہردت تھے اور منشی لالہ سداسکھ اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور کلکتہ کے سرکلر روڈ سے ہر بُدھ کو شائع ہوتا تھا۔ جامِ جہاں نما کے بعد کلکتہ سے ہی شمس الاخبار کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا۔ اس کے جاری ہونے کی تاریخ مئی 1823 تھی۔ یہ اخبار بھی ہفتہ وار تھا۔ کلکتہ سے اردو صحافت کے پہلے دور میں کئی اخبارات جاری ہوئے تھے۔ 1833 کے آس پاس آئینہ سکندری شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ اور ہر پیر کو چھپتا تھا۔ کلکتہ سے ہی ماہ عالم افروز کے نام سے ایک اخبار 23 مارچ 1833 کو شروع ہوا۔ کلکتہ سے سلطان الاخبار کے نام سے 2 اگست 1835 کو ایک اخبار شروع ہوا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور ہر اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ کلکتہ سے ہی مہر منیر کے نام سے محلّہ کلنگہ سنہری باغ سے یکم مئی 1841 کو ایک اخبار شائع ہونا شروع ہوا جو ہفتے میں تین بار نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر محمد علی تھے۔ مراۃ الاخبار کے نام سے کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار 1847 میں منظر عام پر آیا۔ کلکتہ سے ہی یکم فروری 1851 کو گلشن نو بہار کے نام سے ایک اخبار شروع ہوا تھا۔ جامِ جہاں نما کے نام سے ایک اور اخبار کلکتہ سے ہی 1842 میں شروع ہوا تھا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ اس کے مالک منشی غلام حسین تھے۔ 1844 میں کلکتہ سے مخزن الادویہ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی شروعات ہوئی۔ اس اخبار کو ایک ایرانی حاجی آقا احمد خاں شیرازی نے شروع کیا تھا۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ جس نے ارباب اقتدار، عوام اور سبھی چیزوں پر اثرات مرتب کیے، ہندوستان کی اردو صحافت بھی اس سے کافی متاثر ہوئی اور غدر کے وقت اردو اخبارات بڑی تعداد میں بند ہوگئے۔ انگریزوں نے نئے قوانین بنا دیے اور سیکڑوں مطابع بند کر دیے گئے۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد لوگوں کی حالت بہت دگرگوں ہوگئی تھی۔ خاص طور سے مسلمانوں کے حالات بہت ہی بدتر ہوگئے تھے ایسی حالت میں اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت ایک بہت بڑی بات تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے تک اردو میں صرف ہفتہ وار اخبار، پندرہ روزہ یا ماہانہ رسائل ہی تھے وہ بھی غدر کے بعد شاذ و نادر ہی بچے تھے۔ لیکن غدر کے بعد یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اب روزانہ اخبار کی شروعات کی جائے تا کہ لوگوں کو ملک میں ہونے والی اُتھل پتھل اور ہر لمحہ رنگ بدلتی انگریزوں کی سیاست اور ان کی حکومت کے تعلق سے خبریں مل سکیں۔ اردو روزنامے کی شروعات 1858 میں کلکتہ سے ہوئی۔ اردو کا پہلا روزنامہ اردو گائیڈ تھا جسے مولوی کبیر الدین نے شروع کیا تھا۔ اس میں چار صفحے ہوتے تھے۔ یہ اخبار مطبع مظہر العجائب سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے امیروں، نوابوں کے حالات بھی چھپتے تھے۔ اس اخبار کی غرض و غایت کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

> ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی مذہبوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتابیں چھاپتے اور پمفلٹ تقسیم کرتے تھے۔ شروع میں کافی عرصے تک ہندوستان کے لوگ اُن کی حرکتوں کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان حرکتوں کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوئی۔

بیسویں صدی اردو صحافت کے لیے نئے ہنگامے اور نئے انقلابات لے کر آئی۔ دنیا کے سیاسی نقشے میں کئی تبدیلیاں آئیں اور دنیا نے پہلی جنگ عظیم کا بھی سامنا کیا۔ ہندوستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح نئی تبدیلیاں ہوئیں اور اردو صحافت بھی ان ہنگاموں اور تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بیسویں صدی کی شروعات ہوئی تو کئی نئے اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔

1911 میں مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے انگریزی زبان میں ہفتہ وار کامریڈ کی شروعات کی۔ بعد میں جب دارالسلطنت دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ کو دہلی سے جاری کیا اور دہلی سے ہی 23 فروری 1913 کو اردو زبان میں روزنامہ 'ہمدرد' کی شروعات کی۔ ہمدرد شروع کرنے کا مقصد مسلمانوں کی خدمت کرنا تھا۔ خلافت تحریک اور کانگریس کے نظریات اس اخبار میں چھائے رہتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے 13 جولائی 1912 سے ہفتہ وار الہلال کا آغاز کیا۔ مولانا آزاد الہلال کے شروع کرنے سے قبل ہی صحافت کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس سے قبل انھوں نے گلدستہ نیرنگ عالم 1899 میں جاری کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے لسان الصدق (1903-1905) جاری کیا۔ کلکتہ سے نکلنے والے احسن الاخبار سے بھی وابستہ رہے۔ تحفہ محمدیہ اور خدنگ نظر کی شروعات بھی مولانا نے ہی کی تھی۔ مولانا 'الندوہ' اور وکیل سے بھی جڑے رہے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کی اصل صحافتی طاقت الہلال سے منظر عام پر آئی۔ انھوں نے ہندوستانی عوام کو الہلال کے ذریعے خواب غفلت سے بیدار کیا اور برطانوی

حکومت کو بھی یہ باور کرایا کہ ہندوستانی عوام اب اور زیادہ دن تک غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑے رہیں گے۔ الہلال میں مذہب وسیاست، معاشیات و نفسیات، تاریخ و جغرافیہ، ادب و حالات حاضرہ کے موضوع پر اعلیٰ قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ الہلال میں شبلی نعمانی، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی جیسے اہم اور بلند پایہ قلم کاروں کی تحریریں شامل اشاعت ہوا کرتی تھیں۔ 16 نومبر 1914 کو حکومت ہند نے الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کرلی۔ بعد میں دس ہزار کی نئی ضمانت مانگی جو منظور نہ ہونے پر الہلال پریس کو بند کردیا گیا۔ اسی دوران البلاغ کی شروعات ہوئی لیکن مولانا کی نظر بندی کی وجہ سے جلد ہی بند ہوگیا۔ بعد میں الہلال 1927 میں جاری ہوا لیکن چھ ماہ بعد ہی بند ہوگیا۔ اردو صحافت کو انقلابی جوش اور جذبے سے مولانا ابو الکلام آزاد نے ہی روشناس کرایا۔

یوں تو اردو میں اخبارات کی شروعات 1822 سے ہوگئی تھی لیکن 1857 تک پہنچتے پہنچتے اس میں کافی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور اردو صحافت نے کئی کروٹیں بدلیں۔ شروع سے لے کر تقریباً 15 برسوں تک اردو صحافت ہفتہ وار اخبارات پر ہی مرکوز رہی اور ایک لمبے عرصے کے بعد اردو میں رسائل کی شروعات ہوئی۔

یوں تو مغربی بنگال کو اردو صحافت کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ اردو کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' یہیں سے نکلنا شروع ہوا۔ پہلا روزنامہ 'اردو گائیڈ' بھی مغربی بنگال کے کلکتہ سے جاری ہوا بلکہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کا پہلا ماہنامہ بھی یہیں سے شروع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کلکتہ ہی وہ شہر ہے جہاں سے اردو کا پہلا کل ہند پیمانے پر مقبول گلدستہ 'نتیجہ سخن' 1881 میں محمد وزیر علی وزیر نے جاری کیا اور کلکتہ ہی وہ شہر ہے جہاں سے اردو کا پہلا ماہنامہ 'نورِ بصیرت' سید محمد عبدالغفور شہباز نے جولائی 1884 میں جاری کیا تھا۔

(بحوالہ: آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو ادب: شانتی بھٹاچاریہ، اکتوبر 1973، ص33)

جب کہ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں کے مطابق اردو کا سب سے پہلا رسالہ خیر خواہ ہند تھا، جو 1884 سے کہیں پہلے 1837 میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا تھا اور اس کے ایڈیٹر ایک عیسائی پادری آر سی ماتھر تھے۔ خیر خواہ ہند مرزا پور سے شائع ہوتا تھا لیکن کلکتہ کے بپٹسٹ مشن پریس سے چھپ کر آتا تھا۔ اسے پہلا رسالہ اس معنی میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں خبریں نہیں بلکہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اردو کے پہلے رسالے کا تعلق بھی بنگال سے ہی تھا اور یہ رسالہ یہیں کے پریس سے چھپ کر جاتا تھا۔ اس رسالے کو پادری صاحب نے مذہب کی تبلیغ کے لیے شروع کیا تھا اور زیادہ تر مذہبی عقائد پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن اردو کا رسالہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔ یہ رسالہ 1857 میں بند ہوگیا اور دوبارہ 1861 میں شروع ہوا تھا۔ اس رسالے کا ایک انتخاب کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں خادم الاسلام کے نام سے ایک ماہانہ رسالے کلکتہ سے یکم ستمبر 1900 سے شروع ہوا۔ یہ نظامی پریس کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر تک اردو صحافت ایک بار پھر اپنے پُرانے حالات پر واپس آنے لگی تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جس طرح سے پریس اور اخبارات پر روک لگا دی گئی تھی وہ اردو صحافت کا بہت افسوسناک باب تھا لیکن سرسید احمد خاں، عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم، منشی سجاد حسین، منشی محبوب عالم جیسے اردو صحافت کے نامور سپوتوں نے صحافت کو دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک اردو صحافت میں نئے نئے تجربے ہونے لگے تھے اور مغربی ادب کا ایک بڑا حصہ ترجمے کی شکل میں اردو حلقوں تک پہنچنے لگا تھا۔ بعد میں اس روایت کو منشی دیا نرائن نگم اور شاہد احمد دہلوی نے اور بھی آگے بڑھایا۔ اگر یہاں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسی عہد میں ادبی صحافت کا مفہوم واضح ہوسکا اور لوگ اخبارات کے علاوہ رسائل و جرائد کو بھی اردو صحافت کا اہم حصہ تصور کرنے لگے۔ اس وقت کے رسائل کی صحافت میں اصلاح کا عنصر، تعلیمی اور تمدنی اصلاحات کرنے کا مقصد، لوگوں میں سیاسی معاشرتی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کا جذبہ اور اردو داں حلقے کو ایک بہتر اور پرسکون زندگی گزارنے اور اپنے طرز عمل میں تبدیلی لانے جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس وقت کی ادبی صحافت میں ایک بڑی تعداد شاعری کے گلدستے اور شعرا کے کلام پر مبنی رسائل کی ہے جن میں زیادہ تر ایسے رسائل ہیں جو کسی انجمن کے ترجمان کے طور پر شروع کیے گئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ رسائل انجمن اور سوسائٹیوں کے مقاصد اور ان کی سرگرمیوں کے تعلق سے زیادہ مواد شائع کرتے تھے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صحافت کا عنصر بھی اس میں شامل رہتا تھا اور اعلیٰ قسم کے مضامین، خبروں کے تجزیے، ترجمہ شدہ مضامین، سرکاری اعلانات و اشتہارات بھی عموماً شائع کیے جاتے تھے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی صحافت کا مقصد اور نظریہ صحافت کے زریں اصولوں پر پورا اترتا ہے اور اس وقت ادبی صحافت بھی اخباری صحافت کی طرح ہی کافی اہم اور قابل قدر تھی۔ ادبی صحافت کا یہی وہ دور تھا جب اردو ادب میں نئی اصناف کا ارتقا ہوا اور ادب و صحافت میں نئے نئے تجربے کیے گئے۔ انشائیے، سوانح عمری، خاکے، ناول، ڈرامے، تنقید، بحث و مباحثے، تاریخی مضامین، مزاحیہ مضامین، آپ بیتی اور مضمون نگاری کی شروعات ادبی صحافت کے اسی دور میں ہوئی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر کی ادبی صحافت نئی صدی کا سامنا کرنے کے لیے خود کو بہت حد تک تیار کرچکی تھی اور اردو صحافت جو کچھ دنوں پہلے تک اخبارات اور پمفلٹ تک محدود تھی اب رسائل و جرائد، گلدستوں اور پندرہ روزہ و ماہانہ پرچوں اور رسائل کے ساتھ ترقی کی راہ پر

گامزن ہوگئی۔

مغربی بنگال سے آفاق، معمار، رسالہ مغربی بنگال، اخوت، ارمغان، آوازِ مشرق، اقدار، پیغام، جدید اردو، دردِ دل، روحِ ادب، ساقی، سبدِ گل، سوز، سیلاب، شہود، شاہین، شمس، ضرب کلیم، نشیمن، نگارِ عالم، چراغِ راہ، عکسِ نو، وغیرہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ آیئے ادھر پچاس ساٹھ برسوں میں نکلنے والے کچھ اہم رسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔ مغربی بنگال کی اردو صحافت پر درجنوں کتب اور مضامین لکھے گئے لیکن جب میں نے اس مضمون کو لکھنے کے لیے مواد کی تلاش کی تو مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ادبی صحافت پر کوئی کتاب تو دور ایک مضمون بھی نظر نہیں آیا۔ یہ اپنے موضوع پر پہلا مضمون ہے تو شاید کچھ رسالوں کا ذکر نہ آسکا ہو، اس کے لیے معذرت۔ میں نے ان رسائل کو ہی ترجیح دی ہے جن سے اردو کا ایک بڑا حلقہ واقف رہا ہے اور جو ریاست سے باہر بھی اردو قاری تک پہنچتا رہا ہے ساتھ ہی ریاستی حکومت سے بھی رجسٹرڈ ہو اور قارئین کا ایک حلقہ اس رسالے کو پسند بھی کرتا ہو۔

پندرہ روزہ ''مغربی بنگال'' حکومت بنگال کے ترجمان کے طور پر شائع ہوتا رہا ہے۔ رسالے کا آغاز 1954 میں ہوا تھا۔ اس میں مارکس، لینن اور بائیں بازو کے نظریات سے متعلق تحریریں بکثرت ہوتی تھیں۔ اردو ادب میں اس نظریے کے حامی شاعروں، ادیبوں کی تخلیقات بھی شامل رہی ہیں۔ مخدوم، ساحر، فیض وغیرہ پر درجنوں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ فیض کے صد سالہ یوم پیدائش پر مغربی بنگال کا خصوصی شمارہ شائع ہوا تھا۔ ریاستی حکومت کی کارگزاریوں اور کامیابیوں کا بھی تذکرہ رسالے میں تسلسل کے ساتھ چھپتا رہا ہے۔ اس رسالے کا ٹیگور نمبر، فیض نمبر، آزادی اور انقلاب نمبر بہت مقبول ہوا تھا۔ مصطفیٰ اکبر جیسی شخصیت کی اس کی ادارت سے وابستگی رہی ہے۔

اگر میں مغربی بنگال کے کلکتہ سے نکلنے والے رسالے حسن وصحت کا تذکرہ نہیں کروں گا تو شاید یہ اپنے موضوع سے ناانصافی ہوگی کیونکہ ماہنامہ 'حسن وصحت' یوں تو صحت اور حسن سے متعلق مضامین پر مشتمل رسالہ تھا لیکن اس میں ادبی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ یہ رسالہ ایک طویل عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ پہلا شمارہ جنوری 1963 میں شائع ہوا۔ اس کی ادارت حکیم ولی احسن انجام دیتے تھے جبکہ مدیر معاون حکیم تبارک کریمی اور مدیر اعزازی نذیر بنارسی تھے۔ پہلے شمارے میں محمود ایوبی کا افسانہ 'کشمکش' شائع ہوا تھا جبکہ رام کرشن مضطر، ابن احمد تاب کی نظمیں بھی شامل شمارہ ہیں۔ ہر شمارے میں ایک افسانہ اور تین چار نظمیں ضرور شائع کی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی رحمٰن حمیدی کا ناول 'شکست خواب' بھی قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ رسالے کے عید نمبر، آزادی نمبر وغیرہ مقبول ہوئے تھے۔ واحد پریمی، کیف انصاری، معصوم شرقی، مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر محمد مجیب وغیرہ کی تحریریں بھی رسالے میں مجھے نظر آئیں۔

ایک اور قابل ذکر رسالہ شہود عالم آفاقی کا 1971 میں جاری کردہ ماہنامہ 'شہود' ہے جو تقریباً 29 برسوں تک نکلتا رہا۔ اس رسالے کی ایڈیٹنگ سے لے کر سپرد ڈاک کرنے تک کا سارا کام شہود عالم آفاقی ہی کرتے رہے ہیں۔ یہ رسالہ کسی تحریک یا ازم سے متاثر نہیں تھا بلکہ ہر مکتب فکر کے ادیبوں، شاعروں کی تحریریں اس میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ اس رسالے میں اداریہ 'پہلی کرن' کے عنوان سے چھپتا تھا۔ شہود عالم آفاقی بڑے بڑے ناقدین سے بھی نہیں ڈرتے تھے اور رسالے میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ اردو کے حالات پر اداریوں میں کافی گفتگو کی ہے۔ شہود عالم آفاقی ایک دردمند دل رکھتے تھے اور ان کی تحریروں میں اردو کا درد صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

نعیم اشفاق نے آسنسول سے خالص علمی، ادبی اور تحقیقی رسالے کے طور پر جنوری تا مارچ 1979 میں سہ ماہی 'پہچان' جاری کیا تھا۔ رسالے میں چیف ایڈیٹر کے طور پر نعیم اشفاق کا نام چھپتا تھا جبکہ عشرت بیتاب کا نام ایڈیٹر اور اقبال سلیم کا نام معاون کے طور پر درج ہوتا تھا۔ شمارے میں تحقیقی مقالے، تعارفی مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ میری نظر سے پہچان کا جو شمارہ گزرا اس میں میراجی، منیر نیازی، منٹو، سلام سندیلوی، وارث علوی، محمود ہاشمی، کمار پاشی، انتظار حسین، جوگندر پال، بلراج مین را، حسین الحق وغیرہ کی تحریریں شامل تھیں۔ ان بڑے ناموں کی موجودگی پہچان کے معیاری ہونے کا ثبوت ہے۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کا ترجمان سہ ماہی رسالہ 'روحِ ادب' اپریل مئی جون 1984 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پہلے شمارے کی مجلس ادارت میں محمد امین، سالک لکھنوی، ابومحفوظ الکریم معصومی، اعزاز افضل، علقمہ شبلی اور محمد فخرالدین شامل تھے جبکہ محمد نظام الدین کا نام بطور ایڈیٹر درج تھا۔ رسالے میں مضامین، نظمیں، بنگلہ ادب، طنز ومزاح، افسانے، ڈرامے، تبصرہ کتب جیسے کالم تھے۔ رسالے کو مشاہیر اصحاب قلم کا تعاون آغاز سے ہی حاصل رہا۔ سرکاری رسالوں کے ساتھ کئی پابندیاں ہوتی ہیں۔ کچھ پالیسیاں ہوتی ہیں۔ ان کے باوجود کئی رسالے ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہیں۔ ایسے رسالوں میں روح ادب بھی شامل ہے۔ روحِ ادب کے مولانا آزاد نمبر، مغربی بنگال میں اردو شاعری نمبر، فیض نمبر، مغربی بنگال اردو ادب نمبر، علی سردار جعفری نمبر کافی مقبول ہوئے۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا نے 'روحِ ادب' کے پہلے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارا
> موجودہ ادبی سرمایہ جسم تو رکھتا ہے روح ناپید ہے،
> اس رسالہ کے اجرا سے امید یہی ہے کہ ادب کے
> جسم میں نئی روح پیدا ہوگی۔ خود اس کے مضامین
> شاہد عادل ہیں۔'' (بحوالہ روح ادب، جولائی۔
> ستمبر 1984)

'انشا' ف س اعجاز کی ادارت میں 1986 سے نکلنا شروع ہوا۔ اس اکیلے رسالے نے کئی دستاویزی خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ کئی ایسے موضوعات پر پورا شمارہ مختص کردیا ہے جس پر ایک مضمون بھی مشکل سے ملتا ہے۔ ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ نمبر، کنور مہندر سنگھ بیدی نمبر، عالمی اردو افسانے نمبر، اسکنڈے نیویائی ادب نمبر، دلیپ سنگھ نمبر، کلکتے کا عصری ادب نمبر، انور شیخ: ادب ومتنازعہ

افکار نمبر اور ابھی گذشتہ سال بھی نئی نسل کے اردو ادیب پر ان کا خصوصی شمارہ منظر عام پر آیا جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ انشا کے ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر پر ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کچھ یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''یہ نمبر اپنے آپ میں منفرد ہے اور ادبی لحاظ سے نہایت وقیع و اہمیت کا حامل ہے۔ اس نمبر کے اشتہار کو دیکھ کر ہی ساری دنیا چونک اٹھی تھی۔ جیالے اور باہمت ادیب و شاعر آگے بڑھے اور اعجاز کی آواز پر لبیک کہا اور دھڑلے کے ساتھ اپنے اپنے عشق کی وارداتیں طشت از بام کرنے کی خاطر مضامین لکھنے لگے......
>
> اس خصوصی نمبر کو کچھ اس انداز سے ترتیب دیا کہ خدانخواستہ اگر عدلیہ کے دروازے بھی کھٹکھٹائے جاتے تو مدیر اور مضمون نگار حضرات پر کوئی حرف نہ آتا۔ یہ نمبر منفرد ہے جس کی پذیرائی دنیا کے دونوں سروں تک اردو والوں نے نہایت خوش دلی اور فرطِ انبساط و نشاط کے ساتھ کی ہے۔
>
> (ف س اعجاز ہشت پہلو فنکار، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط ص 85-284)

'انشا' نے مختلف ادوار میں کئی اہم نمبرات شائع کیے ہیں۔ عالمی اردو افسانہ نمبر، بابری مسجد نمبر اور گفتنی نمبر بہت مقبول ہوئے ہیں۔ گفتنی نمبر میں گزشتہ 23 برسوں کے اداریوں کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ ان اداریوں میں نہایت اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اداریوں کو پڑھ کر کوئی بھی ادبی ذوق و شوق رکھنے والا شخص ف س اعجاز کی قلمی و ادبی صلاحیت کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ ان اداریوں میں پروردگار، شعلے، ہمارے وزیراعظم کے کپڑے، آج کے مشاعرے، عشق بن یہ ادب نہیں آتا، جرم کی رفتار، نظریہ اور قیادت کی ضرورت، انتخابی پھنسیاں، سلسلہ عراق کا، بدھا دیب کی حقیقت پسندی، 26/11 اور پندرھویں لوک سبھا، عالمی اردو افسانے کا عالم، برطانیہ میں اردو کی بقا کا مسئلہ، اختر الایمان، جدیدیت کے تناظر میں وغیرہ موضوعات پر مبنی یہ اداریے ادب کے ساتھ ساتھ ملکی و غیر ملکی منظر نامے کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ ف س اعجاز کے اداریے بڑے ہی چبھتے ہوئے اور دوٹوک ہوتے ہیں ان کا قلم بڑے ہی بے باک انداز میں تبصرے کرتا ہے۔

'انشا' کے کئی شمارے میں نے دیکھے ہیں اور بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انشا اردو کی ادبی صحافت میں اپنی منفرد روش اور یادگار شماروں کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ فیروز سلطان اعجاز صاحب نے انشا سے قبل 'فانوس ڈائجسٹ' بھی جاری کیا تھا اور ایک طویل عرصے تک فلمی صحافت سے بھی وابستہ رہے۔

عنبر شمیم کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی 'دستک' بھی ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کے معاون مدیران فہیم انور اور ممتاز نظر ہیں۔ 'دستک' کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ 1994 پر مشتمل تھا۔ شمارے میں مضامین، غزلیں، خطوط، نظمیں، افسانے، انشائیے، تراجم، تبصرے جیسے کالم تھے، شمس الرحمٰن فاروقی، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، مظہر امام، عنوان چشتی، جیسے نامور ادیبوں، شاعروں نے دستک کے پہلے شمارے پر اپنا ردعمل بھیجا تھا جو دستک کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا تھا:

> ''دستک کا پہلا شمارہ ملا۔ واقعی دیدہ زیب ہے۔ اگر آپ دستک کا یہی صوری اور معنوی معیار ایک درجن شماروں تک باقی رکھنے میں کامیاب ہو گئے تو اردو صحافت کے ادبی میلان میں آپ کا پرچم دیر تک لہراتا رہے گا اور آئندہ نسلوں کے لیے نشانِ منزل کا کام دے گا۔'' (دستک اپریل تا جون 1994، ص 217)

'دستک' میں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت، تاریخ اور فنون لطیفہ سے متعلق مضامین کی اشاعت بھی ہوتی رہی ہے جس سے دستک نے ادبی حلقے میں ایک منفرد شناخت قائم کر لی۔ دستک میں پاکستانی ادیبوں و شاعروں کو بھی شامل کیا جاتا تھا اور 'دستک' برصغیر کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی مقبول ہوا۔

ایک ادبی دستاویز 'اثبات و نفی' کا پہلا شمارہ 1996 میں منظر عام پر آیا تھا جبکہ جنوری تا مارچ 1997 کے شمارے پر جلد 1، شمارہ 1 چھپا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جب میں نے عاصم شہنواز شبلی صاحب سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ رجسٹریشن کے بعد کا یہ پہلا شمارہ تھا جب کہ اس سے قبل 3 شمارے شائع ہو چکے تھے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو 'اثبات و نفی' کا پہلا شمارہ مئی جون جولائی 1996 میں چھپا ہوگا۔ رسالے میں مجھے عاصم شہنواز شبلی کا اداریہ بہت بہتر لگا۔ ان کے اداریوں میں تلخی و ترشی تو ہے ہی ساتھ میں ہم عصر ادب پر بے لاگ اور بے خوف تبصرہ بھی۔ اداریہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ادھر چند برسوں سے ہمارے یہاں یہ چلن عام ہے کہ وہ شاعر و ادیب جن کی حیثیت تخلیقی ادب میں قریب قریب مسلم ہو چکی ہے خود کو ناقد کہلوانے کے لیے صرف اس وجہ سے بے چین رہتے ہیں کہ انھوں نے دو چار دس مضامین لکھ لیے ہیں۔ کیا ہلکے پھلکے تعریفی مضامین لکھ کر تعارفی مقالے، مختصر تبصرے، چھپوا کر کسی شاعر و ادیب کی قصیدہ خوانی کر کے، اپنے معاصر ادیب و شاعر کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر نوعمر اور کمزور شاعروں کی شاعری پر مفصل مضامین لکھ کر وہ ناقد کہلا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کی بھیڑ

دن بدن بڑھتی جارہی ہے جومراسلاتی اندازکی تنقید کر کے ناقد کہلانے کے خواہش مند ہوجاتے ہیں۔''

(اثبات ونفی،جنوری تامارچ 1997،ص9)

جدیدتر ادبی رجحان کے معتبر نمائندے کے طور پر جاری کیے گئے اس سہ ماہی کے مدیران عاصم شہنواز شبلی اور شگفتہ طلعت سیما ہیں۔جبکہ صلاح کار کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی، ظہیرانور، نصرغزالی اور چودھری ابن النصیر کے نام درج تھے۔افضال عاقل، سرورالہدیٰ، راشدانورراشد، نسیم فائق اور مطیع الرحمٰن جامی کے نام معاون مدیران میں شامل تھے۔رسالے کواردوادب کی عظیم شخصیات کا تعاون حاصل تھا۔کالی داس گپتا رضا، جوگندرپال، شاہنواز قریشی، جگن ناتھ آزاد، عتیق اللہ، ظفراقبال، ظفرگورکھپوری، مناظر عاشق ہرگانوی، شرجیل احمد خاں وغیرہ کی تحریریں رسالے میں چھپتی رہی ہیں۔رسالے میں مغربی ادب کا بھی ایک حصہ ہوتا تھا۔نظموں اورغزلوں کا الگ الگ کالم تھا۔کتابوں پر تبصرے بھی چھپتے رہے ہیں۔ایک کالم تجزیہ کا بھی تھا جس کے تحت کسی افسانے پر کھل کر تنقید کی جاتی تھی۔اس ضخیم رسالے کے شاید 9 یا10 شمارے نکلے۔یہ رسالہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے معیاری رسائل کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔

سہ ماہی 'مژگان' نوشادمومن اور سنجر ہلال بھارتی کی ادارت میں شائع ہورہا ہے۔اس کا پہلا شمارہ جولائی 1999 میں شائع ہوا تھا۔یوں تو نوشاد مومن صاحب بینک کی ملازمت کرتے ہیں اور حساب کتاب اوراعدادوشمار میں مصروف رہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ اچھے ادبی صحافی بھی ہیں اور بہت کم عرصے میں مژگاں کے کئی دستاویزی شمارے شائع کر کے اپنی ادبی وصحافتی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ظہیرانور، علقمہ شبلی، انیس انصاری، ناصرہ شرما پرخصوصی گوشوں کے علاوہ نئی نسل نیا ادب نمبر، اردو ڈرامانمبر، بچوں کا ادب نمبر اور حال ہی میں ضخیم وفیات نمبر اور بہار کا ہم عصر ادب نمبر شائع کیا ہے۔وفیات نمبر اس معنی میں اہمیت کا حامل ہے کہ گذشتہ 20 برسوں میں کسی رسالے نے اتنا ضخیم نمبر نہیں شائع کیا۔اس خصوصی شمارے میں حال ہی میں وفات پائے اردو کے ادیبوں، شاعروں پرخصوصی مضامین شائع کیے گئے ہیں ساتھ ہی تمام ادیبوں، شاعروں کے مختصر کوائف پر مبنی تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کی دستاویز بھی شائع کی ہے۔مژگاں کا تاریخی شمارہ نئی نسل نیا ادب نمبر ہے۔اس شمارے کو اردو کی ادبی تاریخ کا ضخیم ترین شمارہ کہا جاسکتا ہے جو 1852 صفحات پر مشتمل ہے۔

مژگان کے کالموں میں لاگ لپیٹ کے بغیر اور اکیسویں صدی کے روشن چراغ قابل ذکر ہیں۔ان کالموں میں تبصرے اوراہم نئے شعرا کی تخلیقات پیش کی جاتی ہے۔ضمیر کاظمی نے مژگان کے ایک شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کلکتہ سے اتنا اعلیٰ اور معیاری رسالہ نکل رہا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اچانک کسی دوشیزہ گل رنگ سے ملاقات ہوگئی ہو۔

'عصری ادب' کا بے باک ترجمان سہ ماہی 'ترکش' 2002 میں جاری ہوا تھا۔اس کے مدیر فراغ روہوی تھے۔اس نے جاوید دانش، شہپر رسول، خورشید اکبر، خالد سہیل، ف س اعجاز، نثار راہی وغیرہ پر خصوصی گوشوں کی اشاعت کی ہے۔

ترکش کے خصوصی نمبروں میں جاوید دانش نمبر کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔یہ نمبر جنوری تا مارچ 2005 میں شائع ہوا تھا۔ترکش کے اس خصوصی نمبر میں جاوید دانش کی شخصیت وفن پر مشتمل 64 اہل قلم کی نگارشات کو شامل کیا گیا ہے۔ان مضامین میں جاوید دانش کی شاعری، دیار غیر میں اردو کے لیے ان کی خدمات اوران کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس ایک خصوصی نمبر کی وجہ سے بھی اسے یاد رکھا جاسکتا ہے۔اس شمارے میں جاوید دانش کی ڈراما نگاری اور شاعری پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔شاید ہی کسی دوسرے رسالے میں جاوید دانش پر اتنی تفصیلات دستیاب ہوں۔سہ ماہی رسالوں میں ترکش کا ایک الگ اور منفرد مقام ہے۔ترکش میں افسانے، مضامین، تبصرے، غزلیں، نظمیں چھپتی تھیں۔

ترقی پسندی اور اشتراکیت کو پروان چڑھانے کے لیے ماہنامہ سہیل کی شروعات گیا سے 1939 میں کی گئی تھی۔اس معروف رسالے کو بسمل سنسہاروی نے شروع کیا تھا۔یہ رسالہ بعد میں بند ہوگیا تھا لیکن 1954 میں اسے ادریس سنسہاروی نے دوبارہ جاری کیا۔ماہنامہ سہیل بہار سے جاری ہونے والے رسالوں میں کافی اہم تصور کیا جاتا ہے۔اس رسالے نے ادب اور صحافت کی کافی خدمت کی اور کئی خصوصی نمبر شائع کیے۔1958 میں سہیل کا جمیل مظہری نمبر شائع ہوا تھا۔کچھ اور خصوصی نمبروں میں بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر 1960، منشی پریم چند نمبر 1980، سہیل عظیم آبادی نمبر 1981، جمیل مظہری نمبر 1983، کیفی اعظمی نمبر 1984، کلام حیدری نمبر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔سہیل کے قلمکاروں میں جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، علیم اللہ حالی، کلام حیدری، مظہرامام، سید احمد قادری جیسے کہنہ مشق ادیب، صحافی اور شاعر شامل تھے۔سہیل میں کہنہ مشق شعرا، ادبا کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی کافی جگہ ملی۔سہیل نے صوبہ بہار میں اور خاص طور سے گیا میں ادبی ماحول تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔بہار کی ادبی صحافت کو پروان چڑھانے میں اس رسالے کا نام ہمیشہ سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔

کولکاتا سے رسالہ 'سہیل' کی دوسری اشاعت کا آغاز مارچ 2012 سے ہوتا ہے۔کولکاتا سے نکلنے والے سہیل کے ایک کے بعد ایک کئی خصوصی شمارے نکلے۔جمیل منظر صاحب نے اپنی لیاقت وصلاحیت سے سہیل کے بے حد معیاری پرویز شاہدی نمبر، احتشام حسین نمبر، سالک لکھنوی نمبر، پروفیسر لطف الرحمٰن نمبر وغیرہ نکالے ہیں۔تمام خصوصی نمبر دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ڈاکٹر شاہد ساز اپنی کتاب 'جمیل منظر: بحیثیت صحافی میں لکھتے ہیں:

''جمیل منظر صاحب کی ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ مارچ 2012 سے دسمبر 2013

تک ماہنامہ تھا۔ ان دو برسوں میں سہیل نے کئی یادگار اور دستاویزی نمبر ادب اردو کو دیے جن میں پرویز شاہدی نمبر، احتشام حسین نمبر، سالک لکھنوی نمبر اور پروفیسر اور لطف الرحمٰن نمبر مقبولیت کی سند سے سرفراز ہوئے۔ جنوری 2014 سے سہیل دو ماہی کی صورت میں تشنگان علم وادب کی پیاس بجھا رہا ہے۔'' (ص69)

کولکاتا سے ایک تحقیقی وتنقیدی رسالہ سہ ماہی 'فکر وتحریر' (خالص ادبی قدروں کا عکاس) اپریل 2014 سے جاری کیا گیا۔ یہ رسالہ ڈاکٹر نعیم انیس کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ رسالے میں ریسرچ اسکالر کے مضامین پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد مغرب میں اردو نظم، سرسید، اعزاز افضل، انیس رفیع، منوررانا اور مقصود انور پر خصوصی گوشے شائع کیے گئے ہیں۔ 'فکر وتحریر' نے ایک خصوصی شمارہ بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کے موضوع پر بھی شائع کیا ہے جس کی اردو حلقے میں کافی پذیرائی کی گئی۔ بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کی صورت حال پر اتنی تفصیلی گفتگو اس سے قبل کسی رسالے میں نہیں کی گئی۔ ایک شمارہ ریسرچ اسکالر پر مرکوز تھا جس میں سارے مضامین اور تخلیقات ریسرچ اسکالرز کے تھے۔ یہ رسالہ آج بھی اپنی معیاری تحریروں سے اردو حلقے کو منور کر رہا ہے۔

ایس ایم اظہر عالم اور ان کی بیگم محترمہ اوما جھن جھن والا نے اپنے تھیٹر گروپ لٹل تھیسپین کے ترجمان کے طور پر رنگ رس کا آغاز کیا تھا۔ پہلا شمارہ جنوری تا جون 2015 پر مشتمل تھا۔ یہ رسالہ پہلے سہ ماہی تھا بعد میں اسے ششماہی کر دیا گیا۔ پہلے شمارے میں احمد سہیل، رشید نیروا، سلام بن رزاق کی تحریریں شامل ہیں۔ گروپ کے تھیٹر فیسٹول سے متعلق رپورٹ بھی شمارے میں دی گئی ہے۔ یوں تو تھیٹر سے متعلق مضامین 'ذہن جدید' اور 'آجکل' جیسے رسالوں میں چھپتے رہے ہیں لیکن تھیٹر کے لیے مکمل طور پر وقف اپنی نوعیت کا یہ واحد رسالہ تھا۔

ماہنامہ جدید اردو پرویز شاہدی کی ادارت میں 1938 میں جاری ہوا۔ ان کے علاوہ مغربی بنگال سے جن اہم ادبی رسالوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے ان میں ماہنامہ دیوار (برنپور)، بزم ہند (آسنسول)، وقار (کلٹی)، دستخط (بارکپور)، تخلیق ہوڑہ، شہر نو (مٹیا برج)، طاؤس، قناعت، جادو، بگولہ، سراغ، مساوات، حیات، اقدار، نقوش رنگیں، معاون (کلکتہ) رابطہ، کہکشاں، کاوش، محفل (مٹیا برج۔ مدیر الف انصاری)، قرطاس وقلم (کانکی نارہ۔ مدیر احمد وکیل علیمی) صدف (جگتدل)، پرواز (مدیر اعزازی ڈاکٹر نعیم انیس) کہکشاں (ٹیٹا گڑھ)، آئینہ خیال، موج قلم، لخت جگر، مینار عظمت، نئی صبح، حروف، کاف نون، عمران راقم کا صورت، کمال احمد کا لٹل میگزین انکور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان رسائل سے مغربی بنگال کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی تصویر سامنے آتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ادبی صحافت کے میدان میں بھی یہ سرزمین بہت زرخیز ہے۔

ملک کی مختلف ریاستوں بشمول مغربی بنگال آج درجنوں کی تعداد میں رسالے نکل رہے ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں چھپ رہی ہیں لیکن کیا ہم ان رسائل و جرائد اور کتابوں سے انصاف کر پا رہے ہیں۔ کیا ہر اردو والا آج ایمانداری سے ایک نیا اردو قاری بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا ہم اردو کے فروغ میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ہم سب کو غور کرنے کی ضرورت ہے اور ان سوالوں کے جواب میں ہی اردو کے فروغ اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ باتیں بہت ہیں لیکن میں رسالہ 'پہچان' کے ایک شمارے میں شائع آخری سطور پر اپنی باتیں ختم کرتا ہوں، یہ باتیں آج 40 سال بعد بھی اتنی ہی کارآمد ہیں جتنی اس وقت تھیں۔

اردو رسالے بند کیوں ہو جاتے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور جس کا جواب ہر اردو پڑھنے اور جاننے والا اپنے آپ سے پوچھے تو اپنے اندر کے آدمی سے نظریں ملانے میں شرم محسوس کرے گا۔

کیا اردو زبان سے تعلق رکھنے والوں میں قوت خرید نہیں؟......

کوئی اردو رسالہ اگر بند ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار اردو رسالہ پڑھنے والا عام آدمی نہیں۔ خالص ادبی رسالے عام آدمی کے مطالعے میں نہیں آتے۔ یونیورسٹی اور کالج میں اردو پڑھانے والے اساتذہ کرام، اردو پڑھنے والے طلبا ور اردو ادب سے تعلق رکھنے والے شاعر و ادیب ہوتے ہیں جو خالص ادبی رسالے پڑھتے ہیں۔

اگر طلبا دیگر ضروریات تعلیمی کے ساتھ ادب کی موجودہ رفتار سے واقفیت حاصل کرنے کی خاطر خالص ادبی رسالہ خریدیں تو رسالہ کیوں بند ہو؟

اگر اردو کے اساتذۂ کرام، طالب علم، شاعر و ادیب رسالے خرید کر پڑھیں تو رسالہ کیوں بند ہو؟

اگر اس قسم کے اشخاص کی مجموعی تعداد ہندوستان میں ایک لاکھ بھی ہو تو کیا ہم تمام اردو رسالوں کی کھپت ممکن نہیں؟

لیکن اس طرح کی قربانی کون دیتا ہے؟ اردو زبان کو مرتے دیکھنا گوارہ ہے لیکن اردو رسالے کی خریداری، یہ ممکن نہیں——

کاش ہم لوگ اردو سے محبت کا صحیح جذبہ رکھتے۔ ●●

دو ماہی لکھنؤ

گلبن

9452813289

غضنفر کی خاکہ نگاری۔'روئے خوش رنگ' کے حوالے سے

ڈاکٹرحنا آفریں

'روئے خوش رنگ' غضنفر کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو۲۰۱۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس سے پہلے ان کے خاکوں کا مجموعہ 'سرخ رو' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔'روئے خوش رنگ' میں سترہ بلند پایہ، عظیم شخصیات کے خاکے شامل ہیں جن میں کچھ کو چھوڑ کر بیشتر کا تعلق اردو زبان وادب سے ہے۔کتاب کا دیباچہ مشہور ومعروف خاکہ نگار مجتبیٰ حسین نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے مختصراً مگر جامع غضنفر کی خاکہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔

غضنفر کے خاکوں میں ہمدردی کا جذبہ موجِ تہہ نشیں کی طرح نظر آتا ہے جو خاکہ نگاری کی خوبی ہے۔غضنفر شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی جانب بھی اشارے کر دیتے ہیں مگر اس خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ کہ وہ غور کرنے پر محسوس ہوتی ہیں۔اس کے متعلق مجتبیٰ حسین کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

'میں نے خاکے میں بیگ کو ویسا ہی پایا جیسے کہ وہ ہیں۔اس خاکے کے اساس پر میں نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ غضنفر جو بھی لکھتے ہیں سچ لکھتے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں لکھتے۔کہا جاتا ہے کہ سچ کڑوا بھی ہوتا ہے لیکن کڑواہٹ غضنفر کے خاکوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔کیونکہ خاکہ نگار کی حلاوت تحریر میں اتنی گھلی ہوئی ہوتی ہے کہ کڑواہٹ کو سر اُٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔'(روئے خوش رنگ از غضنفر،ص ۱۷)

یہ غضنفر کے مزاج کی شگفتگی ہے جو ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے اور اسی سبب سے ناگوار بات بھی قاری کو گراں محسوس نہیں ہوتی۔

غضنفر کے خاکوں میں بزرگوں کا ادب واحترام اور ہم عصروں کے لیے خلوص ومحبت نظر آتی ہے۔غضنفر کے خاکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ تحریر کرتے ہیں اس کے نام سے قاری کو ابتداً واقف نہیں کراتے بلکہ ایک تجسس پیدا کرتے ہوئے اسے اخیر میں تحریر کرتے ہیں۔اگر قاری شخصیت سے واقف ہے تو خاکہ پڑھ کر بہ آسانی یہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ خاکہ کس شخصیت سے متعلق ہے۔یہ خاکہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔

'روئے خوش رنگ' میں شامل پہلا خاکہ 'آئینۂ عکسِ برعکس' عنوان سے تحریر ہے جو پروفیسر شافع قدوائی کا خاکہ ہے جنھیں ماس میڈیا سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو ادب سے دلچسپی ہے جس کا ثبوت اردو میں ان کی وہ تحریریں ہیں جو رسائل میں تواتر کے ساتھ مضمون کی شکل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔شافع کا خاکہ پڑھ کر ان کی ایک مکمل شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے جو اُن سے واقف نہیں ہے اسے بھی ان کے متعلق معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ان کی شکل وصورت، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا حلیہ، ان کی ذہانت، ان کی بے باکی، دوسروں کے لیے ان کی ایماندارانہ رائے کا اظہار اور ان سے وابستہ مخصوص جملوں کا ذکر نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔مثال کے طور پر اقتباسات دیکھیے:

'بناؤ، سجاؤ، رچاؤ اور کساؤ سے خالی ڈھیلے ڈھالے بدن سے ایک نہایت فعال، متحرک، پُر جوش، ہمہ وقت ہلنے ڈولنے اور بات بات میں قہقہہ لگانے والی شخصیت باہر آ گئی۔اس شخصیت کے باطن کا شور، اس کا اضطراب، اس کی فعالیت اور اس کا عمل سبھی چیخ چیخ کر بتانے لگے کہ وہ شافع ہے۔'(ص ۲۱)

چونکہ غضنفر نے یہ خاکہ اپنے ہم عمر اور دوست شافع قدوائی کا لکھا ہے اس لیے اس خاکہ میں زبان بے تکلف اور شگفتہ استعمال کی ہے۔

کتاب میں شامل دوسرا خاکہ 'بیگم رضیہ حلیم جنگ' عنوان سے ہے جو ممتاز شاعرہ ہونے کے علاوہ مرحوم حلیم جنگ کی بیوی، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور سابق لفٹیننٹ گورنر دہلی (نجیب جنگ) کی ماں اور مولانا عبدالرحمٰن بجنوری کی سگی بھانجی ہیں۔اس خاکے میں غضنفر نے بیگم رضیہ حلیم جنگ کی ظاہری شخصیت کے ساتھ ان کی باطنی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔غضنفر یہ خاکہ ایک بزرگ اور معتبر ہستی کا لکھ رہے تھے اس لیے اس میں انھوں نے ادب واحترام کا خاص خیال رکھا ہے اور ایک ماں کے متعلق جس طرح کی محبت وعقیدت اور جذبات واحساسات ہو سکتے ہیں ان کے اس خاکے میں دکھائی دیتے ہیں۔

اس خاکے میں غضنفر نے بیگم رضیہ حلیم جنگ کا خاندانی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ان کی شرافت، خاکساری، اعلیٰ ظرفی، روشن خیالی، پریشان حال اور مجبور وبے کس لوگوں کے لیے ان کی ہمدردی وغیرہ صفات اس خاکے میں نظر آتی ہیں جو اُن کی شخصیت کا حصہ ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

'بولتے وقت وہ بار بار اس بات کا اعتراف کر رہی تھی کہ اسے اردو نہیں آتی۔اسے ایسا ماحول نہیں ملا جہاں وہ اردو زبان سیکھ پاتی۔۔۔۔میں حیرت زدہ ہو جاتا تھا، اس لیے کہ جس زبان میں وہ گفتگو کر رہی تھی، وہ ہم سے اچھی تھی۔پھر اس نے اپنی بیاض سے اپنا شعری کلام بھی سنایا اور ہم نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بیاض کا رسم خط اردو تھا۔۔۔۔شاید اسے اس بات کا رنج تھا کہ وہ ایسی اردو نہ جان سکی جیسی عبدالرحمٰن بجنوری جانتے تھے۔'(ص ۳۶)

'اماں ہر ہفتے اپنے یہاں ایک اجتماعی دعا کراتی ہیں اور اس دعا میں آس پاس کی غریب، مجبور اور بے سہارا عورتیں شرکت کرتی ہیں۔اماں دعا اس لیے کراتی ہیں کہ ان بے بس وبے آسرا عورتوں پر خدائے بزرگ وبرتر کا خاص کرم ہو جائے اور ان کے دکھ درد اور دلدّر دور ہو جائیں۔دعا میں شریک ہونے

والی عورتوں کے چائے پانی کو حسبِ ضرورت کوئی نہ کوئی سامان بھی دیا جاتا ہے۔اماں کا یہ معمول بلا ناغہ برسوں سے چلا آرہا ہے۔' (ص۴۳)

اقتباس کی قرأت کے بعد بیگم رضیہ حلیم جنگ کے مزاج اور کردار پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ کتنی ہمدرد اور منکسر المزاج عورت ہیں۔ وہ مجبور و بے کس لوگوں کی اس طرح مدد کرتیں کہ انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی مدد کی جا رہی ہے۔

اس خاکے میں بیگم رضیہ حلیم جنگ کے علاوہ حلیم جنگ کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ کچھ ایسے واقعات پیش کیے گئے ہیں جن سے ان کے مزاج اور کردار پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی کہ بیگم رضیہ حلیم جنگ کی شخصیت کو نکھارنے میں ان کا کتنا عمل دخل تھا۔ بیانیہ انداز میں اس خاکے کو تحریر کیا گیا ہے۔

'روئے خوش رنگ' میں شامل تیسرا خاکہ 'پورٹریٹ کا عنوان' نام سے تحریر ہے۔ یہ خاکہ ممتاز و معروف افسانہ نگار طارق چھتاری کا ہے جن کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ہے۔ اس خاکے کی خوبی یہ ہے کہ اسے اس طرح داستانوی انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ قاری کی دلچسپی اور تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے اور وہ یہ جاننے کے لیے بے چین رہتا ہے کہ خاکہ نگار کس کا ذکر کر رہا ہے۔ غضنفر پہیلیاں بجھاتے ہوئے اخیر میں طارق چھتاری کا نام تحریر کرتے ہیں جو ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار انسان ہیں۔ مثالیں دیکھیے:

'وہ نہایت عمدہ، نفیس اور موزوں لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں، کلائی اور ٹخنوں تک ڈھکے ہوئے تھے۔۔۔۔ پیروں کی جلد بھی اس کے چہرے کی طرح صاف ستھری، گوری چٹی اور نرم و نازک ضرور تھی مگر چہرے کی بناوٹ اور کلائی کی چوڑی ہڈیاں اس کی صلابت کی بھی غمازی کر رہی تھیں۔' (ص۴۷)

'جس نے ایسا اسلوب وضع کیا کہ جس کے ایجازی طرزِ اظہار نے عبارت کو جملے، جملے کو لفظ اور لفظ کو پیکر میں ڈھال دیا۔۔۔۔ جس کی تکنیکی ہنرمندی نے تفصیل کو ایجاز و اختصار میں بدل دیا۔۔۔ جس کی فکشن فہمی کا یہ عالم تھا کہ نظر پڑتے ہی لفظ اپنے لب کھولنے لگتے۔ معانی اپنی پرتیں ہٹانے لگتے۔ بین السطور میں تصویریں اُبھر آتیں۔ کہانی وہ بھی کہنے لگتی جو کہا نہیں گیا۔ جس کی سمجھ پر اعتبار و اعتماد کا یہ حال تھا کہ اس کے ایک ایک نکتے پر جیّد ناقدینِ ادب اپنے مضامین کی بنیاد رکھتے۔' (ص۵۲تا۵۳)

غضنفر چونکہ فکشن نگار ہیں اس لیے ان کا یہ رنگ خاکے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ طارق چھتاری کا نام تحریر کرنے کے لیے نیم پلیٹ کا استعمال کیا ہے جو طارق چھتاری کے افسانے کا نام ہے جبکہ پورٹریٹ عنوان کی مناسبت سے غضنفر نے کینوس لفظ کا استعمال کر کے واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ ایک فنکارانہ ہنرمندی ہے کہ وہ طارق چھتاری کی تخلیقات کے عنوانات کو اس طرح واقعات میں جذب کر دیتے ہیں کہ وہ انھی کی گفتگو کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

'روئے خوش رنگ' میں شامل چوتھا خاکہ 'پیدا کہاں ہیں ایسے پرا گندہ طبع لوگ' پروفیسر ساجدہ زیدی کا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم کی استاد ہونے کے ساتھ ممتاز شاعرہ، ناول نگار، ڈراما نگار اور نقاد تھیں۔ انھوں نے مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ اس خاکے کی قرأت کے بعد ساجدہ زیدی کے پوشیدہ پہلو بھی قارئین پر روشن ہو جاتے ہیں اور یہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ غضنفر نے کتنی باریک بینی سے ان کا مشاہدہ کیا تھا کہ ان کے مزاج، کردار، عادتوں، خوبیوں اور پسند، ناپسند کی بھی عکاسی کر دی ہے۔

غضنفر نے ساجدہ زیدی کی ایک منفرد عادت سگریٹ نوشی کا ذکر ہمدردانہ رویے کے ساتھ اس طرح کیا ہے کہ خامی بھی خوبی معلوم ہونے لگتی ہے۔ منفرد اس لیے کہ ہندوستان میں سگریٹ نوشی عورتوں سے مخصوص نہیں ہے۔ غضنفر نے اس خاکے میں بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ ساجدہ زیدی کے روشن اور پوشیدہ دونوں پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ مثلاً

'مغربی معاشرے میں پرورش پانے اور اسی انداز سے جینے کا رنگ ڈھنگ اپنانے اور ترقی پسند خیالات رکھنے کے باعث ساجدہ آپا کے متعلق دوسروں کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ تصور گھر کر گیا تھا کہ مذہب سے انھیں کوئی واسطہ نہیں لیکن ایک دن ہمارا یہ تصور غلط ثابت ہو گیا۔ ایک دن میں ساجدہ آپا کے گھر کسی کام سے گیا ہوا تھا۔۔۔۔ مغرب کی اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میرا ہاتھ حسبِ عادت جیب سے رومال نکال لایا۔ یہ دیکھتے ہی وہ بول پڑیں 'نماز پڑھنا چاہتے ہو مگر مسجد تو یہاں سے ذرا دور ہے۔ جماعت سے نماز نہیں مل پائے گی۔ بہتر ہے یہیں پڑھ لو۔ ادھر غسل خانے میں وضو کا لوٹا رکھا ہوا ہے، جانماز میں لاتی ہوں۔' (ص۶۲)

اس کے بعد غضنفر نے 'تنِ ناتواں کے تار و پود' کے عنوان سے ممتاز و معروف نقاد وہاب اشرفی کا خاکہ تحریر کیا ہے۔ جو تاریخ ادب اردو، تاریخ ادبیاتِ عالم، نئی سمت کی آواز، تفہیم فکر و معنی اور قدیم مغربی تنقید جیسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ خاکے کا عنوان ہی قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ خاکہ شخصیت کے بالکل برعکس ہے کیونکہ وہاب اشرفی کا بظاہر جسم کمزور اور نازک دکھائی دیتا تھا مگر باطن اتنا ہی مضبوط اور توانا تھا۔ غضنفر نے بظاہر نظر آنے والی خصوصیات کے علاوہ وہاب اشرفی کی باطنی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ وہاب اشرفی کی شرافت، ہمدردی، بے خوفی، دلچسپیاں، خاطر مدارات، ادب سے ان کا شغف، خاکساری اور انکساری کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ غیر جانبداری اور ہمدردانہ رویے کے ساتھ ان کی خوبیوں اور خامیوں کی تصویر کشی کی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

'نئے سے نئے تخلیق کار کو بھی تاریخ ادبیات میں جگہ دیتے وقت قلم رکتا نہیں۔ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتا۔ ادبی محفلوں اور مذاکروں میں نو آموز فنکاروں کے تعارفی بیان میں بھی زبان لکنت کی شکار نہیں ہوتی۔' (ص۶۹)

'جب میں 'آمد' کی رسم اجرا کے سلسلے میں پٹنہ گیا ہوا تھا۔ اجرا سے ایک دن قبل خورشید اکبر کے ساتھ وہاب صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا۔ وہاب صاحب بستر پر لیٹے بلکہ پڑے تھے بالکل بے حس و حرکت۔ جیسے سفید چادر میں لپیٹ کر کوئی لاش رکھ دی گئی ہو۔۔۔۔ مگر دوسرے دن محفل میں انھیں دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میری حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی جب انھوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر تقریباً چالیس پینتالیس منٹ تک دھواں دار تقریر کی۔' (ص۷۰تا۷۱)

ان اقتباسات کی روشنی میں جہاں وہاب اشرفی کی خصوصیات

سامنے آتی ہیں۔ وہیں غضنفر کا غیر جانبدار اور ہمدردانہ رویہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔

غضنفر نے وہاب اشرفی کی تصویر کھینچنے میں جس طرح واقعات اور الفاظ کا سہارا لیا وہ اپنے آپ میں خوب ہے، اس طرح کی تصویر بنائی ہے کہ جیتے جاگتے وہاب اشرفی سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاب اشرفی کا خاکہ اپنے آپ میں مکمل اور بھرپور ہے۔ اس میں کئی جگہ غضنفر خود بھی چلتے پھرتے نظر آئے ہیں۔ یہ اس بات کی غمازی ہے کہ غضنفر کا موصوف سے کس حد تک تعلق تھا۔

'روئے خوش رنگ' کا چھٹا خاکہ پروفیسر علی رفاد فتیحی کا ہے جو اس تصنیف میں 'تنگ زمینی میں وسعتِ قلبی کا منظر' عنوان سے شامل ہے۔ فتیحی جن کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے ہے مگر اردو شعر و ادب سے ان کی دلچسپی کم نہیں۔ اردو رسم خط اور املا کی باریکیوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ فتیحی محض اچھے اسکالر ہی نہیں بلکہ اچھے استاد بھی ہیں۔ ایسے موضوعات ان کی نگاہوں کا مرکز بنتے ہیں جہاں عام طور پر لوگوں کی نظریں نہیں پہنچتیں۔ مثال کے طور پر کچھ اقتباسات دیکھیے:

'اس کی بعض خوبیاں اتنی نمایاں اور ایسی متحرک ہوئیں کہ اس کے ہاتھوں اچھے شاگردوں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو گئی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ جی جان لگا کر اپنے شاگردوں کو قابل بنایا بلکہ اپنے رسوخ کا استعمال کر کے انھیں کامیابی کی سیڑھیاں بھی چڑھائیں۔' (ص۸۰)

'فتیحی کا ایک اور پہلو جو مجھ پر روشن ہوا، وہ ہے رواداری۔ ان کی رواداری گھر، دفتر، محلّہ، پڑوس، ہر جگہ نظر آتی ہے۔۔۔۔ انھوں نے سولن میں اپنے ایک دوست کے اشتراک کے ساتھ رہائشی زمین کا ایک خطہ خریدا۔۔۔۔ جب مکان بن گئے تو پارٹنر نے ایسی چال دکھائی کہ فتیحی کا راستہ بند ہو گیا۔ فتیحی کی رواداری نے اپنے لیے ایک ٹیڑھے میڑھے دشوار گزار راستے کا انتخاب کرنا گوارا کیا مگر دوسرے پڑوسی سے اس بات کے لیے لڑنا جھگڑنا مناسب نہیں سمجھا۔' (ص۸۷)

غضنفر نے اس خاکے میں فتیحی کی ظاہری خوبیوں کے ساتھ باطن کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے جس سے ان کے باریک مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔ غضنفر نے اس خاکے میں فتیحی کی قابلیت، طالب علموں کے لیے ان کا ہمدردانہ رویہ، رواداری، والدین کی خدمت کا جذبہ، عورت کے ساتھ مساویانہ سلوک، عزم مصمم، اردو زبان و ادب کے لیے ان کی محبت اور دلی وابستگی ان سبھی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

غضنفر نے 'روئے خوش رنگ' میں شامل خاکہ 'جینے کے بہانے بھی گئے' میں عبید الرحمٰن کا نقشہ کھینچا ہے۔ عبید الرحمٰن سائنس سے وابستگی کے باوجود اردو ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ سائنس میں ان کی کتابیں 'نئے مناظر'، نئے امکانات، کچھ سائنس سے، سائنس کوئز اور سائنس سب کے لیے وغیرہ ہیں جبکہ اردو میں ان کے شعری مجموعے 'آواز کے سائے' اور 'سوچ آبشار' شائع ہو چکے ہیں۔ غضنفر سے ان کی پہلی ملاقات لکھنؤ اور دوبارہ دہلی میں ہوئی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر روز ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غضنفر نے یہ خاکہ عبید الرحمٰن کے انتقال کے بعد تحریر کیا ہے۔ لٰہذا اس میں دوست کے لیے ہمدردی اور محبت کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال دیکھیے:

'میں اکثر حیرت سے یہ سوچتا کہ دلّی کے دباؤ سے جہاں دل و دماغ اتنے سکڑ جاتے ہیں کہ خود اپنے لیے بھی جگہ نہیں بچتی وہاں یہ کیسا شخص ہے جو کسی کی کتاب کے لیے رسم اجرا کی محفل سجا رہا ہے، کسی کی عیادت کے لیے اس کے گھر جا رہا ہے، کسی کے پاس اپنا مکان ہو جائے اس کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے، کسی دوسرے کی بچی کی شادی کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ کسی کے حج یا کسی اور سفر کی واپسی پر دعوتوں کا اہتمام کر رہا ہے۔' (ص۹۲)

'حاصلِ سیرِ جہاں کچھ نہیں، حیرانی ہے' عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ مشہور و ممتاز شاعر شہریار کے ایک شعر کا مصرع ہے اور اسی میں ان کے کلیات کا نام 'حاصلِ سیرِ جہاں' بھی تحریر ہے۔ یہ خاکہ غضنفر نے استاد محترم پروفیسر کنور اخلاق محمد خاں شہریار پر لکھا ہے۔ شہریار اسمِ اعظم، ساتواں در اور خواب کا در بند ہے جیسے شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں انھیں 'گیان پیٹھ' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

غضنفر اس خاکے میں اپنے مخصوص انداز میں استاد محترم کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے ساتھ رشتے کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ شہریار نے انھیں صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ ان کی تربیت بھی کی۔ وقتاً فوقتاً انھیں زندگی گزارنے کے گُر سکھائے، اعتدال و توازن کا راستہ بتایا، وقت کی اہمیت، ملازمت کے تقاضے اور ایمانداری سے واقف کرایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عادات و اطوار کے ذریعے ایسے پہلو روشن کر دیے جس سے رہنمائی کا راستہ صاف دکھائی دینے لگے۔ استاد کا ادب و احترام اور اپنے محسن کے لیے احسان مند رہنا سکھایا۔ ہمیشہ دوسروں کے مثبت پہلوؤں پر ہی نگاہ رکھنے کی بات کہی۔ وہ لکھتے ہیں:

'مانا ہمارے وہ مخالف ہیں مگر آپ کے تو وہ بھی استاد ہیں۔ آپ کو ان کے پاس بھی جانا چاہیے اور ان کا احترام بھی ویسا ہی کرنا چاہیے جیسا کہ آپ میرا کرتے ہیں'۔۔۔۔

'سروس جوائن کرنے جا رہے ہو تو ایک بات کا خیال رکھنا، وقت پر جانا اور پورے وقت تک آفس میں رہنا'۔۔۔۔

'خوش رہنا اور رکھنا چاہتے ہو تو دوسروں کے مثبت پہلوؤں کو ہی نگاہ میں رکھو'۔۔۔۔

'زندگی میں کامیابی کے لیے اعتدال اور توازن کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ہنر ابوالکلام قاسمی سے سیکھنا چاہیے'۔۔۔۔

'غضنفر! اپنے محسن کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ تم نے نارنگ کا خاکہ لکھ کر بہت اچھا کیا'۔۔۔۔

میرے کانوں میں گونجنے والے یہ ارشادات آنکھوں میں کسی پیر و مرشد کی شبیہ اُبھار رہے تھے۔ ایک ایسے پیر کی جو اپنے مریدوں کو ایسے ایسے اقوالِ زریں سے نوازتا ہے جن سے تاریک راہیں دمک اٹھتی ہیں۔ سفر ٹھوکروں کی زد سے بچ جاتا ہے۔ صعوبتیں سبک ہو جاتی ہیں اور زندگی بہ آسانی منزل آشنا ہو جاتی ہے۔' (ص۹۶تا۹۸)

بیوی سے ترکِ تعلق کا غم شہریار کو ہمیشہ ستاتا رہا۔ ان کے اس غم کو غضنفر نے محسوس کیا اور اپنے الفاظ میں اس طرح تحریر کیا:

’شریکِ سفر سے الگ ہو کر شہریار بے درد نہیں بنے۔ خوش کبھی نہیں بیٹھے۔ دوری کا درد انھیں ہر وقت دکھ دیتا رہا۔۔۔۔ ترکِ تعلق کے باوجود انھیں بچھڑنے والے کی کبھی کبھی نہیں، بلکہ اکثر ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ انھوں نے ہمیشہ چاہا کہ رنجش دور ہو جائے۔۔۔۔ دل صاف ہو جائے۔ جیسے بھی ہو بات بن جائے‘ (ص ۱۰۵)

’روئے خوش رنگ‘ میں شامل ’خوشبوئے خوش خلقی‘ عنوان سے تحریر کردہ خاکہ ممتاز نقاد پروفیسر صغیر افراہیم کا ہے جن کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ہے۔ وہ استاد کے علاوہ رسالہ ’تہذیب الاخلاق‘ کے مدیر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جو ’اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل‘، نثری داستانوں کا سفر، اردو فکشن: تنقید و تجزیہ، اردو کا افسانوی ادب، افسانوی ادب کی نئی قرأت جیسی کتابوں کے مصنف ہیں۔

غضنفر نے اپنے مخصوص انداز میں صغیر افراہیم کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ خواہ ان کی نکتہ شناسی ہو، کام کے لیے ان کی دُھن، محنت و لگن، ان کی ملنساری، ان کی قوتِ برداشت، ان کی ثنا خوانی (جو دشمن کو اپنا دوست بنا لیتی ہے) یا پھر ڈپارٹمنٹ، اکیڈمک اسٹاف کالج ہو یا اقامتی ہالوں کا انتظام، سب جگہ وہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں اس میں ان کی شریک حیات سیما بھی ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ مختصراً غضنفر نے سیما کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غضنفر نے اس خاکے میں محض واقعات ہی بیان نہیں کیے ہیں بلکہ ان کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ جس سے وہ بہتر زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ اقتباسات دیکھیے:

’وہ ایسا ملنسار ہے کہ اس سے ملنے والا دیر تک اپنے اندر خلوص و محبت اور خوش خلقی کی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ یہ اس کا ایسا وصف ہے کہ جس نے ایک عالم کو اپنا دوست اور گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ ایسی خوبی ہے کہ اس کے سامنے دشمن کے نیزے کی انّی کند پڑ جاتی ہے۔ نفرت کا چاقو اپنی دھار کھو بیٹھتا ہے۔۔۔۔ اس کے وصف ملنساری نے اسے ایسا جنکشن بنا دیا ہے کہ جہاں پورب، پچھّم، اُتّر، دکن ہر سمت سے آنے والی ٹرینیں نہ صرف یہ کہ قیام کرتی ہیں بلکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ حیدر آباد، ممبئی، کلکتہ، کشمیر یہاں تک کہ کراچی اور لاہور سے آنے والے ادیب بڑے بڑے جید اور نامور ادیبوں کو چھوڑ کر صرف اس سے رشتہ جوڑیں اور اسی کے یہاں قیام کریں۔‘ (ص ۱۱۳)

’وہ پیٹھ پیچھے لوگوں کی ثنا خوانی کرتا ہے۔ عام طور پر لوگ جب کسی سے ملتے ہیں تو اس شخص کے رقیبوں، دشمنوں کی اس کے سامنے برائی کرتے ہیں تاکہ وہ خوش ہو جائے مگر اس کا وتیرہ اس کے برعکس ہوتا ہے، وہ دشمن کی برائی نہیں کرتا بلکہ اس کو بہتر بنا کر پیش کرتا ہے۔۔۔۔ اس کے اس جھوٹ سے رشتے اور بگڑنے کے بجائے بنتے ہیں۔ کڑواہٹ دور ہوتی ہے اور آپس کی رنجشیں ختم ہوتی ہیں۔‘ (ص ۱۱۴)

غضنفر نے غیر جانبداری اور تجزیاتی ذہن کے ساتھ یہ خاکہ تحریر کیا ہے۔ واقعات کے ذریعے خوبیوں اور خامیوں دونوں پر روشنی ڈالی ہے۔

’دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں‘ عنوان سے تحریر کردہ خاکہ نامور و ممتاز شاعر معین احسن جذبی کا ہے جن کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے تھا۔ ان کا شمار ترقی پسند شاعروں فیض، جوش اور مجاز کے ساتھ لیا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی انھی کی طرح جذب و مستی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور اردو ادب کو ’گداز شب‘ اور ’فروزاں‘ جیسے شعری مجموعے دیے۔ ان کی زندگی مشکلوں اور پریشانیوں میں گزری جس کا اثر ان کی شاعری پر دیکھا جا سکتا ہے مگر زمانے کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے انتقام لینے کے بجائے انھوں نے صبر و تحمل کا راستہ اختیار کیا اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے جس کی بدولت انھیں غالب ایوارڈ، اقبال سمّان، کل ہند بہادر شاہ ظفر وغیرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

غضنفر نے جذبی کی زود نویسی، میکشی، بے باکی اور گوشہ نشینی کے واقعات کی تصویر کشی خوبصورت اور شگفتہ انداز میں کی ہے مگر اس کے باوجود ایک بزرگ کے احترام کو فراموش نہیں کیا بلکہ ہمدردانہ جذبے کے ساتھ غضنفر واقعات کی پرتیں کھولتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً:

’سیوانِ کی اس ملاقات میں گوشہ نشینی اختیار کرنے اور مسلسل چُپّی سادھ لینے والے جذبی نے ایسی جلوت پسندی اور محفل بازی کا ثبوت دیا کہ ہم دنگ رہ گئے۔ دورانِ میکشی انھوں نے ایسے ایسے قصے سنائے اور نشے کی ترنگوں کے ساتھ لطائف کے ایسے ایسے شگوفے چھوڑے کہ ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ عالم سرور میں ایک ایسا مقام بھی آیا جہاں جذبی نے ترنم سے غزلیں بھی سنائیں۔‘ (ص ۱۱۹)

انسان بظاہر خود پر ایک خول چڑھائے رہتا ہے مگر کچھ موقعوں پر وہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ غضنفر کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے جذبی کی ان خوبیوں کو تلاش کر لیا جو عام طور پر لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ جیسے ان کی گوشہ نشینی کے برخلاف محفل بازی اور جلوت پسندی، سنجیدگی کے برخلاف مزاحیہ حس، عام طور پر تحت میں اشعار اور عالمِ سرور میں ترنم میں غزلیں گنگنانا، جذبی کی یہ وہ خصوصیات تھیں جو لوگوں سے پوشیدہ تھیں انھیں غضنفر منظر عام پر لے آئے۔

پورے خاکے میں جذبی کے لیے غضنفر کا ادب و احترام صاف دکھائی دیتا ہے مگر اس کے باوجود غضنفر نے ان کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی شگفتہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ان خوبیوں کے پسِ پشت کون سے محرکات کام کر رہے تھے ان سے نتائج بھی برآمد کیے ہیں۔

’روئے خوش رنگ‘ میں شامل خاکہ ’سازِ بوالعجبی کا تارِ حیات‘ مشہور و ممتاز فکشن نگار شوکت حیات کا ہے جو ’گنبد کے کبوتر‘ جیسی تصنیف کے خالق ہیں۔ کچھ لوگوں کی شخصیت عجیب و غریب صفات کی حامل ہوتی ہے انھیں میں شوکت حیات بھی ہیں۔ انھوں نے کہیں شوکت حیات کی عجلت پسندی تو کہیں اطمینان قلبی، کہیں شعلہ صفتی تو کہیں شبنم مزاجی جیسی صفات کے واقعات تحریر کر کے ہمارے سامنے جیتے جاگتے شوکت حیات کو لا کھڑا کیا ہے۔ غضنفر صرف دور سے شخصیت کا مشاہدہ نہیں کرتے ہیں بلکہ خاکہ میں خود بھی شامل رہتے ہیں۔ شوکت حیات کی شخصیت میں جو متضاد صفات موجود تھیں، ان کی عکاسی خوبصورتی سے کی ہے۔ خواہ تعارفی جملوں میں ان کا نام دیر سے آنا ہو، اس کے علاوہ ایک جانب ان کے پاس وسیلۂ آمدنی نہ ہونا اور دوسری جانب دوستوں،

عزیزوں کے لیے دسترخوان پر بچھے انواع واقسام کے کھانے کا منظر اور ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے میٹر کے گھومنے کا خوف نہ ہونا، یہ وہ باتیں ہیں جو انھیں منفرد بناتی ہیں اور دوسروں کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

'اقتصادی بدحالی کے آنگن میں خوش حالی کا بچھنے والا دسترخوان اور اس پر آئے دن چنے جانے والے انواع واقسام کے مرغن پکوان اور درجنوں کی تعداد میں ماحضر تناول فرمانے والے معزز مہمان اور اس بے ملازمت تہی دست انسان کو حاتم طائی بنانے والے منظر پُر فیضان بھی اسے حیرت انگیز ثابت کرتے ہیں۔' (ص۱۳۴ تا ۱۳۵)

'میڈیکل کی پڑھائی جس کے سوتے جاگتے سپنے دیکھے جاتے ہیں ۔۔۔۔اس کورس میں اپنی لیاقت کے بل بوتے پر داخلہ لے کر اور ایک سال تک پڑھائی کرنے کے بعد صرف اس سلوگن کو سن کر High technical education makes a man solve of Bourgeois society اسے چھوڑ دینا بھی شوکت حیات کو منفرد بناتا ہے۔ ممکن ہے شوکت حیات کا یہ عمل بعض نگاہوں میں نادانی کا یا احمقانہ عمل لگتا ہو لیکن یہ بے مثال عمل اسی سے سرزد ہو سکتا ہے جس کی سرشت انسانی محبت کے خمیر سے گندھی ہو اور جس کا دل ایسا گداز ہو جو ایک مٹّی سے پیدا ہونے والے انسانوں کے درمیان تفریق کے تصور سے کانپ اٹھتا ہو۔' (ص۱۳۷ تا ۱۳۸)

جو کام دوسروں کے لیے احمقانہ ہیں، غضنفر نے ان کے پسِ پشت شخصیت کی نفسیات کو تلاش کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ غضنفر کا کمال یہ ہے کہ وہ محض واقعات کو جوں کا توں بیان ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کی مدد سے واقعے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ منفی پہلوؤں سے بھی دامن نہیں بچاتے ہیں۔

'شعاعِ رنگِ رائگاں' سید محمد اشرف پر لکھا خاکہ ہے جس کا عنوان غضنفر نے ان کے افسانے 'تلاشِ رنگِ رائگاں' سے ماخوذ کیا ہے۔ 'بادِ صبا کا انتظار' اور 'ڈار سے بچھڑے' کے خالق اور انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف سے کون واقف نہیں۔ غضنفر نے محض ان کے افسانے سے اپنے خاکے کا عنوان ہی ماخوذ نہیں کیا ہے بلکہ اس افسانے میں موجود 'شیشے' کے لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے الفاظ کا اس طرح جادو بکھیرا ہے کہ سید محمد اشرف کی تمام صفات ظاہر کر دی ہیں۔ پھر خواہ ان کی بُردباری، شائستگی، خوش ذوقی، خوش مزاجی، انکساری، بے خوفی، بے باکی، مثبت رویہ اور منطقیانہ انداز ہی کیوں نہ ہو۔

غضنفر نے اشرف کی تخلیقات کا ذکر بھی گفتگو کے اس انداز میں کیا ہے کہ وہ اس میں جذب و پیوست ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

'اس کے پاس یہ ایسا شیشہ تھا جو باہر کے رنگوں کو جذب کر کے اندر کے رنگوں سے ملاتا تھا اور دونوں کی آمیزش سے ایسی تصویریں بناتا تھا جن میں ایک ہی چہرہ ایک ہی وقت میں ہنستا بھی تھا اور روتا بھی تھا۔ آدمی جانور بن جاتا تھا اور جانور آدمی کا روپ لے لیتا تھا۔۔۔۔ پکڑ میں نہ آنے والا روگ بھی ظاہر ہو جاتا تھا۔ دعا بددعا میں تبدیل ہو جاتی تھی۔۔۔۔

ڈار سے بچھڑنے والے پرندے بھی نظر آتے تھے اور موسمِ خزاں میں بادِ صبا کا انتظار کرنے والے پودے بھی دکھائی دیتے تھے۔' (ص۱۴۱)

غضنفر نے اس اقتباس میں اشرف کے افسانوں روگ، دعا اور افسانوی مجموعوں ڈار سے بچھڑے، بادِ صبا کا انتظار کے نام شامل کر کے تحریر کو نہ صرف خوبصورت بنایا بلکہ متضاد الفاظ ہنسنا اور رونا، آدمی اور جانور، روگ کا معلوم نہ ہونا اور پھر معلوم ہو جانا، دعا اور بددعا، موسمِ خزاں اور بادِ صبا جیسے الفاظ کا استعمال کر کے ایک پُراسرار کیفیت پیدا کی ہے۔

اشرف کی شخصیت سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیے جس سے ان کی باطنی صفات قاری پر روشن ہو جاتی ہیں:

'اس کے ہمراہ کار میں بات کرتے ہوئے ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ کار سے جب ہم لوگ باہر اُترے تو خورشید بھائی نے اپنے مرعوبی مزاج کے مطابق جھٹ سے آگے بڑھ کر اس کا بیگ اٹھا لیا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ بڑھا کر خورشید بھائی کے ہاتھ سے بیگ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا:

خورشید صاحب! آپ تو کافی سینئر ہیں۔ یہ کام تو میں اپنے ہمعصر اور ہاسٹل فیلو طارق چھتاری سے بھی نہیں کرا سکتا۔' (ص۱۴۹)

غضنفر نے واقعہ نگاری کے ذریعے سیرت کی عکاسی کی ہے۔ صرف اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس سے تاثر اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔

غضنفر نے اس خاکے میں اشرف کی شخصیت کو متضاد صفات کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی ہے جیسے اشرف کا کم عمری میں کھیلنے کودنے کے بجائے حیات و کائنات کے محاسبانہ مراقبے میں غرق ہونا، ظاہراً ادیبوں جیسا حلیہ نہ ہونا مگر درحقیقت ادیب ہونا، انگریزی جیسے سبجیکٹ پر مہارت کے باوجود اردو مضمون لے کر یونین پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنا، کسی ادبی محفل میں سب کا خاموش رہنا اور اشرف کا مدلل اور منطقیانہ جواب دینا جیسے واقعات بیان کر کے تجزیاتی ذہن کے ساتھ خاکہ تخلیق کیا ہے۔ چونکہ سید محمد اشرف، غضنفر کے محسن ہیں اس لیے ایک محسن کے لیے جو جذبات ہو سکتے ہیں انھیں غضنفر کی تحریر کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے اور دوسرے خاکوں کی طرح غضنفر نے اس میں بھی تجسس کو قائم رکھتے ہوئے اخیر میں شخصیت کا نام تحریر کیا ہے۔

'روئے خوش رنگ' میں شامل 'شہسوارِ رخشِ خامہ' عنوان سے تحریر کردہ خاکہ معروف و ممتاز فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ ذوقی 'لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'، پوکے مان کی دنیا، بھوکا ایتھوپیا، ایک انجانے خوف کی ریہرسل، عقاب کی آنکھیں، شاہی گلدان اور لے سانس بھی آہستہ جیسی تخلیقات کے مصنف ہیں۔

غضنفر نے اس خاکے میں ذوقی کی ظاہری شکل وصورت سے زیادہ ان کی باطنی سرشت پر قلم اٹھایا ہے۔ غضنفر کو ذوقی بڑے امام بخاری اور جنرل پرویز مشرف کے مماثل دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ ذوقی کے دل میں بڑے امام بخاری کی طرح غم خواری ملّت کا درد بھرا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں جنرل پرویز مشرف کی مانند جوش و ولولہ بھی نظر آتا ہے۔ ذوقی کسی کی پرواہ کیے بغیر براہِ راست انداز اپناتے ہوئے اپنی بات کہتے ہیں۔ خواہ وہ کسی کو اچھی لگے یا بُری،

غضنفر نے ذوقی کی جلد غصہ کرنے کی عادت تو بیان کی۔اس کے علاوہ ہمدردانہ رویے کے ساتھ اس کی توجیہ بھی پیش کی ہے۔لکھتے ہیں:

’ مشرف کو غصہ صرف اس لیے نہیں آتا کہ وہ نامساعد حالات سے جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور اپنے مزاج کے خلاف ہونے والی بات سے سلگ اُٹھتے ہیں بلکہ انھیں غصہ اس لیے بھی آتا ہے کہ وہ معاشرے کے جس سلگتے ہوئے مسئلے کو موضوع بناتے ہیں اور جس کے لیے جی کھپاتے ہیں، جان جوکھم میں ڈالتے ہیں ۔۔۔۔جس مسئلے کی آگ میں تقریباً سبھی اردو والے گھرے ہوئے ہیں، اور جس کی آنچ سے سلگ رہے ہیں، تپ رہے ہیں، اس کے باوجود اردو والے مشرف کی اس کاوش کی داد نہیں دیتے۔۔۔۔بلکہ بعض حضرات تو عیب بھی نکالتے ہیں۔۔۔۔

کھلا ریمارک دینے والوں کو کبھی یہ نظر نہیں آتا کہ ذوقی کی ان کھلی ہوئے تحریروں میں دنیا جہاں کا کیسا کیسا راز بند ہے؟ کیسا کیسا درد پنہاں ہے؟ ۔۔۔۔ان کی آنکھیں یہ نہیں دیکھ پاتیں کہ ان میں سونامی کی ہولنا کیاں بھی ہیں اور اس کی زد میں آئے معصوم انسانوں کی بربادیاں بھی۔‘(ص ۱۵۵تا ۱۵۷)

غضنفر نے جس طرح ذوقی کے غصے کی توجیہ بیان کی ہے اس سے قاری کے دل میں ایک ہمدردانہ اور مثبت رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔غضنفر کا کمال یہ ہے کہ وہ عام اور چھوٹے واقعات کے ذریعے شخصیت کے پہلوؤں کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔

شامل کتاب خاکہ ’فکشن کا فسوں ساز‘ ممتاز و منفرد اور نامور فکشن نگار قاضی عبدالستار کا ہے۔قاضی عبدالستار رضو باجی، غبارِ شب، شب گزیدہ، دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی، خالد بن ولید اور پیتل کا گھنٹا جیسے فنپاروں کے مصنف ہیں جو اپنی ذہانت اور بے باکی کے لیے جانے جاتے ہیں۔محفلوں کو کامیاب بنانے کے لیے انھیں مدعو تو کیا جاتا مگر میزبان اور منتظمین خوف زدہ رہتے کہ کب وہ حالتِ جلال میں پہنچ جائیں اور انھیں نقصان اٹھانا پڑے لیکن غضنفر کے مطابق وہ ایسے مواقع کم ہی آنے دیتے ہیں جن سے ان کے میزبان کو ان کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑے۔شاگردوں کے ساتھ ان کا سلوک محبت آمیز ہوتا اور وہ ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آتے ہیں۔مثلاً:

’ایک روز استاد نے خاص طور پر مجھے اپنے گھر بلایا اور لکھنے پڑھنے کا ایک ضروری کام مجھے سونپ دیا۔مشکل سے ایک سوا گھنٹا گزرا ہوگا کہ۔۔۔۔

’بس اب اور نہیں، لیجیے یہ پھل کھائیے اور چائے پیجیے۔‘

سر میں تھکا نہیں ہوں۔‘میں بولا تو بولے۔‘

’مجھے معلوم ہے کہ آپ جوانی کے جوش سے لبریز ہیں اور استاد کے کام سے لگے ہوئے ہیں مگر میں دیر تک کسی کو اس حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔میں اپنے طالب علموں کو relaxed mood میں دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ اپنا قلم میز پر رکھ دیں اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے گپ کریں۔‘(ص ۱۶۴تا ۱۶۵)

’صاحبزادے! یاد رکھیے کہ تنقید تخلیق کے راستے میں بھنبھنانے والی مکھی ہوتی ہے جسے تخلیق کا گھوڑا اُڑاتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔‘(ص ۱۶۹ تا ۱۷۰)

غضنفر نے قاضی عبدالستار کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے حلیے، رکھ رکھاؤ اور مخصوص جملوں سے مدد لی ہے۔ادب و احترام اور محبت کے ساتھ غضنفر نے استاد محترم کا خاکہ تحریر کیا ہے۔خاکے کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شخصیت کے ساتھ خاکہ نگار خود بھی اس کے کینوس پر جگہ جگہ نظر آتے ہیں ۔غضنفر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے روزمرہ کے واقعات کی مدد سے استاد محترم کی خوبیاں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ کسی بھی واقعے یا منظر کو سرسری طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ اس کی گہرائی میں اُتر کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

’کج کلاہی کا بانکپن‘ عنوان سے تحریر کردہ خاکہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے منسلک ہیں۔ انگریزی زبان کے پروفیسر اور مغربی مما لک میں رہنے کے باوجود جن پر مغربیت اثر انداز نہیں ہوئی۔ترچھی ٹوپی اور شیروانی پیجامہ پہننے والے عبدالرحیم قدوائی کی ذہانت، مستقل مزاجی، ایمانداری اور انتظامی کاموں پر مہارت کے سبب انھیں نہ صرف اپنے شعبہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ دوسرے تعلیمی شعبوں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

غضنفر نے اس خاکے میں بھرپور طریقے سے عبدالرحیم قدوائی کی شخصیت پیش کی ہے۔خاکہ نگار نے اس خاکے میں قدوائی صاحب کی خوبیاں اور خامیاں دونوں کی عکاسی کر دی ہے جس سے ایک جیتے جاگتے، ٹیڑھی ٹوپی لگائے اور شیروانی پیجامہ پہنے عبدالرحیم قدوائی قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ قدوائی صاحب کی مستقل مزاجی ہو یا ان کی اصول پسندی ہر جگہ وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ان کا دل دردمندی اور رحم دلی کے جذبے سے مالا مال ہے۔سنجیدگی کے ساتھ شوخ رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ٹوپی کے ٹیڑھے پن یا کجی کا سبب غضنفر نے کچھ اس طرح تلاش کیا ہے:

’وہ خاص بات اس ٹوپی کی بناوٹ میں نہیں بلکہ سجاوٹ میں پنہاں تھی۔وہ اس انداز سے سر پر سجتی تھی کہ اس کے اندر سے بانکپن جھانکنے لگتا تھا۔ اس بانکپن کا سبب ترچھاپن تھا۔۔۔۔

اس کلاہ کی کجی پر جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ اس کا سبب صاحبِ کلاہ کی شخصیت کا ٹیڑھپن ہے۔۔۔۔ یہ وہ ٹیڑھپن ہے جس سے معاشرے کی کج رویاں سیدھی ہوتی ہیں۔کج ادائیاں ادب و آداب کی راہ پکڑتی ہیں اور کج اخلاقیاں اخلاقیات کی ڈگر پر چلنے لگتی ہیں۔ یہ وہ ٹیڑھپن ہے جس کی ایک ایک کل سیدھی اور حد درجہ مضبوط ہوتی ہے۔۔۔۔شخصیت کا یہ وہ ٹیڑھپن ہے جسے ٹوٹنا تو پسند ہے لیکن جھکنا گوارا نہیں۔‘(ص ۱۷۱تا ۱۷۲)

’اپنی وضع قطع، طرزِ رہائش، علم و عمل ہر طرح سے مشرقی رنگ میں رنگے ہونے اور سر سے پا تک سنجیدہ بنے رہنے کے باوجود پروفیسر قدوائی کی طبیعت میں شوخ رنگ مچلتا رہتا ہے۔ مختلف محفلوں میں موقع و محل کی مناسبت سے ان کے ہونٹوں سے اچھلنے والے برمحل اور برجستہ جملے، دلچسپ فقرے اور بے ساختہ پھوٹنے والے قہقہے، ان کے رنگِ شوخی طبع کی غمازی کرتے ہیں ۔۔۔۔اور موقع ملنے پر معاملاتِ حیات و کاروبارِ کائنات کو اپنی طنز کا نشانہ بنانے

سے بھی نہیں چُوکتا مگر اندر کا ادیب یہ بھی خیال رکھتا ہے کہ طنز کے تیر کو آبِ ظرافت میں کس طرح بجھایا جاتا ہے۔' (ص ۱۷۹)

غضنفر نے اس خاکے کو تخلیق کرنے میں قدوائی صاحب کے لباس، رہن سہن، سیرت اور کردار سے مدد لی ہے اور خاندانی پس منظر، ذہانت، انتظامی امور پر مہارت، اصول پسندی، موقع و محل کی مناسبت سے محفلوں میں شوخی، ان سب کے امتزاج سے غضنفر نے شخصیت کے خدوخال ابھارے ہیں۔ معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی پُر اثر الفاظ میں خاص ترتیب کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ شخصیت کی زندگی اور اس کا پورا پرتو قاری کے پیش نظر آجاتا ہے۔ غضنفر نے الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے نفسیاتی تجزیے کے ساتھ شخصیت کی خامیوں کو خوبیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ غضنفر کو بیانیہ پر قدرت حاصل ہے، بات کو نئے سے نئے انداز میں کہنے کا فن انھیں منفرد بناتا ہے۔

غضنفر کی تصنیف 'روئے خوش رنگ' میں شامل خاکہ 'مجھ پہ دروازۂ مہتاب کھلا' ممتاز شاعر مہتاب حیدر نقوی پر لکھا گیا ہے۔ مہتاب حیدر نقوی 'شب آہنگ' اور 'ماورائے سخن' جیسے شعری مجموعوں کے خالق ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے سفر میں کسی طرح کی کوئی جلد بازی نہیں کی۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے ہوئے مخلصانہ طور پر لوگوں سے ملتے رہے اور ان کی مدد اور خدمت کرتے رہے۔

غضنفر نے اس خاکے کو تحریر کرنے میں کسی طرح کی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا ہے۔ انھوں نے مہتاب حیدر کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو اجاگر کیا ہے مگر اس میں ان کی خوبیاں خامیوں پر حاوی نظر آتی ہیں۔ غضنفر نے اس خاکے میں شخصیت کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری گفتگو اسی حوالے سے کی ہے۔ چاند کی صفات شخصیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی نرمی، ملائمیت، آہستہ روی، دوسروں کو سکون پہنچانے والی عادت، خاموش مزاجی وغیرہ۔ مثال کے طور پر کچھ اقتباس دیکھیے:

'اس نے اپنے سفرِ حیات میں کسی طرح کی کہیں بھی کوئی جلد بازی نہیں کی ۔۔۔۔ احباب کس مقام پر پہنچ گئے؟ ایسے ویسے کیسے کیسے اور کن کن مسندوں سے جا لگے؟ زندگی کی دوڑ میں وہ خود کہاں اور کتنا پیچھے رہ گیا؟ وہ اپنی اسی درویشانہ شان سے رہتا رہا جس فقیرانہ آن بان سے اس نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے اس آہنگ کو آہنگِ مطمئنہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔' (ص ۱۸۸)

'اس کا ایک آہنگ مخلصانہ آہنگ بھی ہے۔ یہ آہنگ ویسے تو اس کے تمام تر تعلقات میں سنائی دیتا ہے مگر استاد محترم شہریار کے تئیں زیادہ زور و شور سے سنائی پڑتا ہے ۔۔۔۔ بغیر کسی طمع اور غرض کے وہ استاد سے ملتا رہا، ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا، ان کا حکم بجاتا رہا ۔۔۔۔ یہاں تک کہ ان کو راحت پہنچانے کی نیت سے اپنے آرام کو تج کر ان کے ہمراہ مختلف مشاعروں میں جاتا رہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشاعروں میں استاد کی بدولت اسے نفع پہنچتا تھا۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ اسے اس راہ میں مالی فائدے حاصل ہوتے تھے مگر صرف مالی منفعت کے لیے محبت والا وہ کام نہیں کیا جاتا جو وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ اس طرح کا تیاگ تو صرف اور صرف معاملاتِ محبت میں ہوتا ہے۔'

(ص ۱۹۰)

غضنفر کا کمال یہ ہے کہ کہیں وہ شخصیت کی تخلیقات کے عنوانات سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں تو کہیں شخصیت کے نام سے۔ اس خاکے میں غضنفر نے شخصیت کی تخلیق اور نام دونوں سے مدد لے کر اپنی تحریر میں الفاظ کا جادو جگایا ہے۔ 'شبِ آہنگ' مہتاب حیدر نقوی کا شعری مجموعہ ہے۔ غضنفر نے شخصیت کی صفات بیان کرنے میں 'آہنگ' لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تحریر کو دلکش اور رواں تو بنایا ہی، ساتھ ہی اس میں وہی صفات تلاش کی ہیں جو چاند میں ہوتی ہیں۔ غرض غضنفر نے سیرت کی خصوصیات بیان کر کے قاری میں تحریک پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'روئے خوش رنگ' میں شامل آخری خاکہ بہ عنوان 'نجیب جنگ: ایک انوکھی شخصیت' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور سابق لیفٹیننٹ گورنر دہلی کا ہے۔ نجیب جنگ نے نہ صرف جامعہ سے محبت کی بلکہ خدمت کے لیے کوئی تنخواہ بھی نہیں لی۔ نجیب جنگ سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ منصب تک پہنچے مگر وہاں انھوں نے ایمانداری کا راستہ اپنایا اور اس پر مضبوطی سے قائم رہے۔ جامعہ کو اقلیتی کردار کا درجہ دلانے کے لیے اکادمی کونسل کی میٹنگ میں ایسی تقریر کی کہ مخالفت کر رہے لوگ خاموش ہو گئے۔ نجیب جنگ یونیورسٹی میں اپنے ماتحتوں کو اس طرح شاباشی دیتے اور برہمی کا اظہار کرتے جیسے کسی بچے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے طلبہ کا حوصلہ بڑھاتے اور خود بھی کھیلتے۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر بھی کردار نبھاتے۔ اردو ادب سے دلچسپی کے سبب 'مرزا غالب' پڑھنے کے لیے اپنے ایک ماتحت کو استاد مقرر کرتے اور ان کا ایک استاد کی طرح احترام کرتے۔ جامعہ میں پاکستان سینٹر کا قیام ان کی وسیع النظری، دور اندیشی اور بھلائی کے جذبے کو نمایاں کرتا ہے۔

اچھے خاکے کی خوبی یہ ہے کہ خاکہ نگار جذبات اور جوش کو اعتدال میں رکھتے ہوئے ہمدردانہ رویہ اپنا کر شخصیت سے متعلق واقعات کو اس طرح ترتیب دے کہ شخصیت کے منفرد اور مخصوص پہلو روشن ہو جائیں۔ غضنفر یہ خاکہ تحریر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے متوازن رویے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے شخصیت کے نقوش اُبھارے ہیں۔ انھیں ویسا ہی پیش کیا ہے جیسے وہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

'ایک ہندوستانی آئی۔سی۔ایس آفیسر کے لیے اپنی بچیوں کی فیس خواہ اس کی رقم کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، ادا کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ وہ چاہتے تو فیس کیا اپنی اولاد کی خوشی اور کامیابی کے لیے اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن ہمارے ہی ماحول میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو ایسا نہیں کرتا اور اپنا دیسی امیرانہ منصب چھوڑ کر صرف ایماندارانہ معاش کے لیے پردیس چلا جاتا ہے۔ ہے نا عجیب و غریب شخص!' (ص ۱۹۲ تا ۱۹۴)

'جامعہ کو اقلیتی کردار کا درجہ ملنے پر یونیورسٹی اکادمی کونسل کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ایک ممبر نے اقلیتی کردار کی مخالفت کی تو نجیب جنگ کا جذبۂ انصاف اور دردِ ملت جوش میں آگیا اور ان کے لبوں سے ایک ایسی

تقریر جاری ہوگئی جیسے اچانک کسی توپ کا دہانہ کُھل گیا ہو۔اس تقریر میں وہی گرمی تھی جو اپنے وجود اور تشخص کے تحفظ کے لیے کسی انسان کے سینے میں بھری ہوتی ہے۔۔۔بلاشبہ نجیب جنگ کے ایک ایک لفظ،ان کے لب ولہجہ،لفظوں کے زیرو بم،ان کے تیور ہر ایک سے ملّت کی غم خواری کا جذبہ مترشح ہوتا تھا۔'(ص ۱۹۵)

غضنفر نے نجیب جنگ کی سیرت، کردار، گفتار اور مخصوص الفاظ کی مدد سے ان کے نقوش اُبھارے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے نفسیاتی اور منطقیانہ تجزیہ بھی کیا ہے۔خاکہ نگار اکثر شخصیت کے خطوط، خودنوشت،تقریر،انٹرویو اور سوانح کی مدد سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ضروری معلومات اخذ کر کے شخصیت کے خدوخال اُبھارتا ہے۔ غضنفر نے اس خاکے میں نجیب جنگ کے سوانحی مضمون کے کچھ اقتباسات کی مدد سے ان کی شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جس سے تاثر اور زیادہ شدید ہوگیا ہے۔

خاکہ نگار کا فرض ہے کہ وہ دیانت داری سے شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کرے تاکہ شخصیت ایک فرشتہ یا شیطان کی شکل اختیار کرنے کے بجائے ایک منفرد انسان کی صورت میں سامنے آئے۔غضنفر نے اپنے خاکوں میں اس بات کا خیال رکھا ہے۔شخصیت کی تصویر اس کے اپنے اصلی رنگ وروپ میں کرتے ہیں جس سے قاری یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ وہ اس شخص سے واقف ہے۔

الغرض غضنفر فکشن کی طرح خاکہ نگاری میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ چونکہ غضنفر بنیادی طور پر فکشن نگار ہیں اس لیے ان کا وہ اندازِ بیان یہاں بھی نظر آتا ہے۔ وہ خوبصورت بیانیے کے ساتھ خاکہ تحریر کرتے ہیں۔موضوع سے متعلق واقعات کا بیان نہ صرف خوبصورت انداز میں کرتے ہیں بلکہ جس کا خاکہ تحریر کیا جارہا ہے اس کا تعارف بھی کچھ اس انداز سے کرواتے ہیں کہ قاری کے دل میں اس ہستی کو جاننے کا تجسس بڑھتا چلا جاتا ہے اور شگفتہ تحریر کے ذریعے پہیلیاں بجھاتے ہوئے بیشتر شخصیات کے نام سے قاری کو اخیر میں واقف کراتے ہیں ۔یہ الگ بات ہے کہ واقعات کے درمیان ہی قاری کے لیے ایک کُلو (clue) چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔چونکہ غضنفر کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طالب علمی سے ہی رہا ہے۔اس لیے علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ لوگوں کے خاکے اس کتاب 'روئے خوش رنگ' میں زیادہ ملتے ہیں۔سترہ میں سے گیارہ خاکے ان لوگوں کے ہیں جن کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے۔ وہ خواہ ان کا دوست ہو، ہاسٹل فیلو ہو یا پھر استاد۔غضنفر خاکے کے کینوس پر بیشتر جگہ نظر آجاتے ہیں وہ شاید اس لیے کہ بیشتر شخصیات کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا انھیں موقع ملا تھا۔انھوں نے ایسی ہی شخصیات پر قلم اٹھایا ہے جن سے انسان دوستی، جفاکشی، ایمانداری اور وضع داری وغیرہ خصوصیات کی مثال قائم ہوتی ہے۔ان کے حالات و واقعات قاری کے لیے کسی نہ کسی اعتبار سے قابلِ تقلید ہوسکتے ہیں۔

غضنفر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے موضوع سے متعلق خوبیاں اور خامیاں دونوں کو پیش کرنے کے ساتھ خامیوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔جس سے خامی بھی خوبی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور شخصیت کا منفی پہلو قاری کے دل میں نفرت وکدورت پیدا کرنے کے بجائے ہمدردی پیدا کردیتا ہے اور قاری کو صرف اس کے مثبت پہلو ہی دکھائی دینے لگتے ہیں۔غضنفر نے خاکہ نگاری کی اہم ضرورت ہمدردی کو خاکوں میں بخوبی شامل کیا ہے اور دیانت داری کا خاص خیال رکھا ہے۔غضنفر نے موضوع سے متعلق شخصیات کو انسان کی ہی صورت میں پیش کیا ہے جہاں خوبیوں کے ساتھ کچھ کمیاں اور لغزشیں بھی ہیں جو اسے انسان کے درجے سے آگے بڑھنے نہیں دیتیں جس سے وہ شخصیات قارئین کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل میں ابھر کر آتی ہیں جو اس فن کا تقاضا بھی ہے۔غضنفر شخصیات کی تصنیفات کو اس طرح تحریر میں شامل کردیتے ہیں کہ اس سے تحریر کی روانی پر بالکل اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے تحریر میں دلکشی پیدا ہوتی ہے اور وہ لطف کو دوبالا کردیتی ہیں۔خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ شخصیت کی مناسبت سے اپنا لب ولہجہ اختیار کرے۔اگر شخصیت سنجیدہ اور متین ہے تو لب ولہجہ بھی سنجیدہ اور متین ہوگا۔اس کے برخلاف شخصیت کے مزاج میں مزاح کا عنصر زیادہ ہے تو اس کے لیے زبان بھی ویسی ہی شگفتہ اور انداز مزاحیہ ہوگا۔غضنفر نے اپنے خاکوں میں شخصیت کی عمر، رتبے اور مزاج کا خاص خیال رکھا ہے۔انھوں نے اپنے منفرد انداز کی وجہ سے خاکہ نگاری میں اپنی پہچان بنائی ہے۔●●

فساد اور دیگر نظمیں

مراٹھی نثری نظموں کا اردو ترجمہ

شاعر

ڈی۔کے۔شیخ

مترجم

اسلم مرزا

۲۰۱۹

۲۰۰ روپے

رابطہ مترجم

9552843365

رباعیات

فراغ روھوی

سب ساز پرانے ہوئے ہر ساز بدل
جذبات کے اظہار کا انداز بدل
کیوں ایک ہی مرکز پہ رہے تیری نظر
شاہیں کی طرح سرحدِ پرواز بدل

کب تک میں اکڑتا رہوں خم ہوجاؤں
اب حلقۂ افراد میں ضم ہو جاؤں
اک روز نکل کر میں حصارِ ”میں“ سے
لمحوں کا تقاضا ہے کہ ”ہم“ ہوجاؤں

شاید کہ جنوں کو مرے منظور نہ تھا
اس بات کا میں اہل یا مقدور نہ تھا
کیوں لب پہ مرے آتی اناالحق کی صدا
اس دور کا میں سرمد و منصور نہ تھا

شعلوں سے گزرنے کا عمل جاری ہے
کھائی میں اُترنے کا عمل جاری ہے
وہ ڈوب کے تخئیل کے دریا میں فراؔغ
مدت سے اُبھرنے کا عمل جاری ہے

دیکھا جو نہیں ہے وہی دیکھا جائے
سوچا جو نہیں ہے وہی سوچا جائے
خود اپنی پرستش کا نشہ چکھنے کو
اک بت کبھی اپنا بھی تراشا جائے

ایسا تھا کہاں تیرا مقدر مٹی
تھا حسن کہاں تجھ کو میسر مٹی
کر شکر کہ کمہار کے ہاتھوں لگ کر
شہکار ہوئی چاک پہ جا کر مٹی

میں شان سے ہر روز گزارا ہوتا
سانسوں کا کرم مجھ کو گوارا ہوتا
پھرتا نہ لیے بار پشیمانی کا
جیون کا اگر قرض اُتارا ہوتا

دل کو مرے احساسِ قرینہ بھی تھا
با دیدۂ تر شان سے جینا بھی تھا
سقراط کی مانند خموشی سے مجھے
ہر زہرِ رفاقت یہاں پینا بھی تھا

اشکوں میں ترے پوچھ کہ کیا کیا ڈوبا
ہر شکوہ شکایت کا پلندہ ڈوبا
سب بھول کے خود بھینچ لیا میں نے تجھے
دل اور مرے ضبط کا یارا ڈوبا

آیا ہے عجب وقت عزا داری کا
حل کوئی نہیں چھوت کی بیماری کا
ڈرتا ہوں کہ لگ جائے نہ تم کو بھی فراغ
گھیرے ہے مرض سب کو اداکاری کا

بھیگا ہوا دامن مرے احساس کا ہے
چہرے پہ مرے رنگ عجب یاس کا ہے
ہرگز نہ کروں شکوہ کبھی بادل سے
اصرار یہی مجھ سے مری پیاس کا ہے

کاغذ پہ مصور کا ہنر کھلتا ہے
پتھر پہ ہی آزر کا ہنر کھلتا ہے
لب سوچ کے کھولو کہ زباں کھلتے ہی
محفل میں سخنور کا ہنر کھلتا ہے

ر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے

رسائل

سہ ماہی فکر و تحقیق

ماہنامہ اردو دنیا

ماہنامہ خواتین کی دنیا

ماہنامہ بچوں کی دنیا

یہ سبھی رسائل دیدہ زیب بھی ہیں اور لائق مطالعہ بھی۔

گیان چند کینتھ نشتر دہلوی کا پہلا افسانوں کا مجموعہ

درد کے سائے

صفحات

۱۹۴

قیمت

۳۰۰ روپے

سنہ اشاعت

۲۰۱۹ء

روح کا موسم

گلزار جاوید

ہمارے قلمی سفر کی روداد' زندگی کے دو تہائی یعنی چالیس سالوں پر محیط ہے پہلے سرے سے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے اس قدر اُلجھاؤ اور پیچ وخم سے گذرنا پڑتا ہے کہ کم حوصلہ لوگوں کا سانس پھولتے ہی بنے۔ کئی بار ہم زندگی سے اور زندگی ہم سے اس قدر اُکتائے ہیں کہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ کئی بار زندگی کو ہم پر اور ہمیں زندگی پر اس قدر پیار آیا ہے کہ دنیا بھر کی خوشیاں دامن میں سمیٹنے کی ہوس دامن گیر رہی ہے......!

اوّل احباب قلمکار ماننے پر تیار نہ تھے....! ادب کے کئی مہا گھروں کی خاک چھاننے' کئی اونچے دروازوں کے آگے سیس جھکانے' زندگی کی ان گنت راتوں کی قربانی اور بہت سے سہانے دنوں کی بلی چڑھانے کے بعد قلمی برادری میں داخلہ نصیب میں آیا' مسئلہ پھر اپنی شناخت کا درپیش ہوا اس کے لئے رگوں میں دوڑتے لہو اور جسم کو حرارت بخشنے والی چکنائی وقت کی بے رحم بھٹی اور احباب کی بے مروّت کٹھالی میں وقت سے پہلے اس قدر بے دردی سے پگھلائی گئی کہ شاعر بھی چلاّ اُٹھا:

جل گیا سارا بدن اِن موسموں کی آگ میں
ایک موسم روح کا ہے جس میں اب زندہ ہوں میں

سردار بلبیر سنگھ ہے تو شاعر وہ بھی نظم کا' ہندی' اردو' پنجابی میں جس قدر روانی' سلاست اور چاشنی کے ساتھ وہ نظمیں کہہ رہا ہے کسی اور کو یہ ملکہ اُس کے ہم عصروں میں حاصل نہ ہے۔ شہرت کے باب میں بلبیر بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ کالج کے دنوں میں کہی نظموں کے عوض اُسے ملک گیر شہرت نصیب ہو گئی تھی۔ بین الاقوامی طور پر اُس کا نام ایاّم شباب میں عروج پا چکا تھا۔ چار دہائیوں میں کئی درجن کتابوں کا بیسٹ سیلر مصنف گذشتہ بہت سالوں سے ہمارا مہربان' مربّی' مداح اور دوست ہے۔ گو ہمارے مزاج اور ادبی رویّوں میں قطعی مماثلت نہ ہے۔ منزل ہماری مشترکہ طور پر ایک یعنی بنی نوع انسان اور اُس کی فلاح ہے۔ وہ اس راستے پر' لطیف و نفیس احساسات کی مہک کے پھول لے کر گامزن ہے جب کہ ہمارے ہاتھ میں اپنے معاشرے کی بدصورتیوں کا الم ہے۔ اُس کا قلم چمن در چمن' ہمارا قلم بے رحم نشتر' اُس کے ذہن میں خوبصورتی کا تصور' ہمارے دل میں بدصورتی کا غم' وہ بات کو چاندی کا ورق لگا کر شیرے میں ڈبو کر پان کی گلوری کی طرح سلیقے سے پیش کرنے کا ماہر' ہم لوہے میں گرمی پیدا کر کے شدت کی چوٹ مارنے پر آمادہ۔ اس قدر واضح' دوٹوک نظریاتی و فنی بُعد کے باوجود ہم ایک دوسرے کے قاری بھی ہیں ناقد بھی' مداح بھی ہیں ناصح بھی' ہم سفر ہیں ہم ساز بھی' ہم آواز ہیں ہم راز بھی' شریک غم ہیں چارہ ساز بھی۔

قدرت نے ہماری یکجائی میں ایک کرشمہ پوشیدہ اور بھی کر دیا ہے.....! تقسیم وطن کے بعد ہم دونوں اپنی جائے پیدائش سے منتقل ہو کر ایک دوسرے کے تولیدی وطن میں بس گئے ہیں۔ وہ ادھر کے گیت گا کر قلب کو گرماتا ہے ہم اُدھر کے راگ چھیڑ کر دل کو برماتے ہیں۔ اُس کے خوابوں کا چاند نگر ہمارے گھر آنگن میں چٹک رہا ہے ہمارے ارمانوں کی فصل اُس کے ویہڑے میں پک رہی ہے۔

آنکھیں ہر دو طرف یار کی دید کو ترس رہی تھیں۔ دونوں اطراف ہجر کا مشترک الاپ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی قنوطیت کے زیر اثر کاگا سے آنکھوں کو محفوظ و سلامت چھوڑنے کی بنتی بھی ہو رہی تھی۔

کاگا سب تن کھائیو' سو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو' اُنہیں پیا ملن کی آس

جس قدر لگن ایک دوسرے کے گھر جانے کی تھی اُسی قدر تڑپ اپنے گھر کو ایک دوسرے سے سجانے کی تھی۔ کبھی دل مہمان بننے کو مچلتا کبھی خواہش میزبان بننے پر اُکساتی۔ بلبیر کی نسبت' ہمارا اُس طرف جانا اُس قدر دشوار نہ تھا جس قدر بلبیر کا اِدھر آنا۔ ہمارے خونی رشتوں کی بُو باس اُس طرف ابھی باقی تھی جب کہ بلبیر کے تمام رشتے ناطے' تقسیم کی آندھی اُس طرف اُڑا لے گئی تھی۔ ایک رشتہ تخلیق ہمارے درمیان' رابطے کا مضبوط رسّہ بنا ہوا تھا۔ اپنے اپنے قلمی و قلبی وجدان کے زیر اثر کبھی بلبیر اُسے اپنی اُور کھینچ لیتا کبھی ہم اپنی جانب ڈھلکا لیتے۔ جب بھی کسی جانب سے ارمانوں میں یکجائی کا رنگ بھرنے کی سنجیدہ کوشش ہوتی' کسی نوع کا سرخ فیتہ اڑچن ڈال کر ماتمی کیفیت میں مبتلا کر دیتا.....!

کہتے ہیں! تیسری دنیا کے نلوں کا پانی بھی بڑی سرکار کے حکم کے بغیر نہیں آتا۔ اس بار اُن کے طفیلی ادارے سے ہماری پذیرائی اور پرانے نقشوں میں نیا رنگ بھرنے کی جستجو نے بلبیر کے حوصلوں کو ایڑھ لگا دی۔ سرخ رنگ کے تمام فیتے' یک دم سبز رنگ میں تبدیل ہو کر استقبالی جھنڈیوں کا روپ دھار گئے۔ ہماری روانگی کا پروانہ خود آ کر ہمارے در پر دستک دینے لگا۔ بلبیر سنگھ نے ہمارے اعزاز میں بڑے پیمانے کا جشن برپا کرنے اور اپنا مہمان خاص بنانے کے لیے دن رات ایک کر ڈالے تھے۔

گئے دنوں کی سنہری یادوں' تقسیم کی خونی وارداتوں' اہل خانہ

بلخصوص خواتین اور بچوں کی فرمائشوں‘ احباب کی نصیحتوں‘ حکمرانوں کی تنبیہوں‘ میزبانوں کی تاکیدوں‘ سفر کی صعوبتوں کے ہمراہ‘ اعزازات و انعامات کی تفاصیل‘ علمی و ادبی کارناموں کی زنبیل‘ محاوروں‘ کہاوتوں‘ تلمیحات اور اقوال حُسنہ کی تفسیر‘ نئے پرانے اشعار کی تدوین کرتے بلبیر سنگھ کے ہمراہ جیسے ہی ہم اُس کے گھر کی دہلیز اُلنگنے کا ارادہ باندھ رہے تھے۔ ماتھے پر ایک تیز دھار نوکیلا پتھر اس شدت سے آ کر لگا کہ درد کی تیز لہر سینہ چیرتی ہوئی پیٹھ کے اُس پار جا اُتری! بچپن کے سہانے دن.....! چھوٹے بڑے‘ جلتے بجھتے قمقموں کی مانند جلنے بجھنے لگے۔

☆

”منشی جی! نجمہ نے مجھے پھر مارا ہے‘ یہ دیکھو!“ کلّے کی لالی کو دکھاتے ہوئے منشی جی سے شکایت لگائی۔ معنی خیز مسکراہٹ کو دباتے ہوئے منشی جی نے ناک پر دھرے چشمے سے‘ عقابی آنکھوں کے بنٹے اوپر نیچے کر کے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولے! ”کیوں مارا ہے‘ کوئی وجہ تو ہوگی‘ ضرور تم نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہوگا۔“ ”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا‘ وہ پیڑ سے کٹارے توڑ کے اپنی جھولی میں بھر رہی تھی‘ میں نے کہا مجھے بھی دے‘ کہنے لگی کہ یہ لڑکوں کے کھانے کی چیز نہیں ہے‘ میں نے کہا! نہیں جی تم جھوٹ بول رہی ہو‘ ابّا کو آنے دو میں شکایت لگاؤں گا کہ یہ کیسی کیسی الا بلا کھاتی ہے۔“ ”اچھا اچھا میرے باپ آگے بول آگے۔“ کھرپے کی دھار سے گیلی مٹی چھڑاتے ہوئے منشی جی میری طول کلامی پر ناگواری کا اظہار کرتے.....! دن میں درجنوں بار کبھی میں نجمہ کی کبھی نجمہ میری‘ کبھی طاہرہ کی‘ کبھی رخسانہ کی شکایتیں لے کر منشی جی کے پاس جاتے۔ منشی جی ہر بار ہماری شکایت پر اس سنجیدگی سے توجہ دیتے کہ وہ ہمارے لڑائی جھگڑے نبٹانے پر ہی مامور ہیں۔

سرِ دست عمر کی بابت درست طور پر بتانا مشکل ہے۔ چہرے مہرے کے لحاظ سے آج کل کے ستر پچھتر سال کے بوڑھوں سے زیادہ ہی بوڑھے دکھائی دیتے تھے منشی جی۔ کھدر کا کُرتا‘ لٹھے کا پاجاما‘ سر پہ دوپلّی ٹوپی‘ ناک پہ باوا آدم کے زمانے کا چشمہ‘ پوپلے منہ میں چھالیہ کے بغیر پان اور پیروں میں ٹائر سول کی ایکس کی شکل میں پٹیاں لگی چپل پہنا کرتے‘ سردیوں گرمیوں میں فرق ایک بنڈی کا پڑتا جس کے داہنی جانب بہت بڑی جیب اندر کی طرف ہوا کرتی تھی جس میں منشی جی پینشن سے لے کر روزمرّہ کے اخراجات‘ کرایہ داروں کے حساب‘ جیبی گھڑی اور پان کے جملہ لوازمات ٹھونسے رکھتے تھے۔ مسجد سے ملحقہ بہت ساری زمین خالی پڑی تھی۔ کنٹونمنٹ بورڈ کی نوکری کے تین سال بعد بیگم فوت ہوگئیں۔ خاندان والوں نے آبائی مسجد کی زمین میں کھیتی باڑی شروع کرا دی جس کا انچارج منشی جی کو بنا دیا۔

مسجد کا نام کونجڑی والی مسجد تھا۔ منشی جی یا اُن کے رشتہ داروں میں کوئی شخص نچلے درجہ کا نہ لگتا تھا۔ سب کے سب دھیمے مزاج کے شائستہ لوگ تھے۔ لباس بھی عمدہ پہنتے تھے۔ کہتے ہیں اٹھارہ سو ستاون کے انقلاب میں اُن کے آباؤ اجداد الہ آباد سے منتقل ہو کر یہاں آباد ہوگئے اور مسجد کی جگہ پر انگریز چھاؤنی کی سہولت کے لئے سبزی کی فروخت کا کاروبار کرنے لگے۔ ابتدا میں یہ لوگ کھلی جگہ پر چٹائی بچھا کر باجماعت نماز ادا کیا کرتے۔ ایک مرتبہ انگریز میجر کی انگریز بیوی سبزی لینے آئی اور اُس نے منشی جی کے بڑے بوڑھوں کو باجماعت نماز ادا کرتے دیکھا۔ اُس کے استفسار پر جب بتلایا گیا کہ یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئی۔ بغیر در و دیوار اور چھت کے عبادت کا تصور اُس کے لئے حیران کُن تھا۔ جاتے ہی اُس نے اپنے شوہر کو خوب سخت سست سنائیں جس کے ردعمل میں میجر نے تگ و دو کر کے مذکورہ جگہ مسجد کے لئے الاٹ کرا دی۔ آہستہ آہستہ نئی نسل تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوگئی اور اپنا آبائی کام سبزی فروخت چھوڑ کر دفتری ملازمت میں جُٹ گئی۔

مسجد کی آمدنی بڑھانے کے لئے کوارٹر نما درجن بھر گھر کی تعمیر کر کے صالح اور نیک مسلمانوں کو کرایہ پر لگا دیئے گئے۔ ایک کمرہ کے کوارٹر کا کرایہ پانچ روپیہ اور دو کمرے والے کوارٹر کا کرایہ سات روپیہ تھا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پیشکار صاحب رہتے تھے‘ بائیں ہاتھ عقیلہ باجی کا گھر تھا۔ عقیلہ باجی کے والد کا نام حافظہ گُم کر چکا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ کسی بڑے نواب کے اونچے درجے کے ہرکارے تھے۔ اُن کی چال کا بانک پن اور لہجے کی اُٹھان آج بھی دل کو دہلاتی ہے۔ عقیلہ باجی اُن کی اکلوتی اولاد تھیں۔ اُس وقت وہ پندرھویں کلاس میں پڑھتی تھیں جس کے باعث وہ سب سے الگ‘ سنجیدہ اور آنکھوں پر چشمہ لگائے کتاب کی ورق گردانی یا مطالعہ میں مصروف رہا کرتیں۔ ہمارے کھیلوں میں باقاعدہ حصہ نہ لیتے ہوئے بھی دلچسپی کا اظہار کرتیں۔ کبھی منشی جی دستیاب نہ ہوتے تو وہ ہمارے چھوٹے موٹے جھگڑوں کی منصفی بھی کیا کرتیں۔ پیش کار صاحب کے بڑے لڑکے محمود میاں‘ ڈاکٹر صدیقی کے کلینک میں دسویں کا امتحان دینے کے بعد کمپوڈری کیا کرتے تھے۔ دوسرے نمبر پر رخسانہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ رخسانہ کا رنگ سانولا اور بال کٹے ہوئے تھے۔ منشی جی اُسے پٹھوں والی سرکار کہا کرتے تھے۔ رخسانہ کا چھوٹا بھائی ابرار قریب قریب میرا ہم عمر تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کبھی ابرار کی یا میری لڑائی نہ ہوئی البتہ رخسانہ سے اکثر ہوا کرتی۔

ہمارے گھر سے ملحق یعنی دائیں مڑتے ہوئے طاہرہ کا گھر تھا۔ اتفاق سے طاہرہ اور نجمہ ہم عمر ہی ہوں گی۔ طاہرہ کا رنگ دودھیا‘ آنکھیں شربتی‘ بال سیاہ کالے اور گھنے‘ ہونٹ گلاب سے‘ قد نکلتا ہوا‘ بدن چھریرا اور بلا کی شرارتی بلکہ چلبلی تھی۔ ایک اور خوبی طاہرہ کی ٹھوڑی پہ تل اور اوپر کے دو بڑے دانتوں کے درمیان جھری تھی وہ جب بھی ہنستی ٹھٹّا مار کر ہنستی تھی جس سے اُس کے گلے کی نسیں کھنچ کر نیلی ہو جاتی اور اُس کے حلق کا تالُو صاف دکھائی دینے لگتا تھا۔

نجمہ اور طاہرہ بُوا جی سے کلام پاک ختم کرنے کے بعد‘ گھروں میں بیٹھ کر کڑھائی سلائی اور ہانڈی روٹی میں یکتائی حاصل کر رہی تھیں۔ اُن کے سروں پہ سُگھڑاپے کا بھوت سوار تھا۔ کبھی قریشیا ہاتھ میں ہے کبھی اُون سلائی چل رہی ہے۔ کبھی گڑیا کے کپڑے سل رہے ہیں‘ کبھی ہنڈکُلیا پک رہی ہے۔ نجمہ اور طاہرہ پکی سہیلیاں تھیں۔ ایک دوسرے کا راز چھپانا‘ ایک دوسرے کو کور کرنا اُن کا وطیرہ تھا۔ بات بات پہ جس طرح نجمہ‘ میرے سر پہ چپت رسید کرتی تھی اُسی طرح طاہرہ بھی حق جتاتی تھی۔ نجمہ کے مارنے پر مجھے بہت غصہ آتا تھا جبکہ طاہرہ کے

چیپت پر غصہ کرنے کے بجائے جواب میں اُس کے کولہے پر میں بھی ہلکا سا چپت رسید کر دیا کرتا۔ نجمہ جب سے بڑی ہوئی تھی اُس کا مطالبہ تھا کہ میں اُس کا نام لینے کے بجائے باجی کہا کروں۔ کچھ دنوں سے نجمہ کے ساتھ طاہرہ نے بھی یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ میں نجمہ کی طرح اُسے بھی باجی کہا کروں۔ بقول اُس کے وہ بھی میری بڑی بہن ہے۔ ''کیوں جی! تمہیں کیوں باجی کہوں..... ؟ تم میری بہن تھوڑی ہو' تم تو....!'' ''تم تو کیا.....؟'' طاہرہ درمیان میں ہی میرا جملہ اُچک لیتی۔ وقفہ دے کر' فلمی ہیروئنوں کی طرح آنکھیں مٹکا کر کہتی ''محبوبہ ہو....!''

ہمارے کھیلوں کا مرکز مسجد کا میدان تھا جس میں کچھ دنوں سے' منشی جی نے مولی' گاجر' شلجم' ٹماٹر' بھنڈی' توری' اُگائی ہوئی تھیں جنہیں توڑنا تو کُجا اُن کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنا بھی ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔ منشی جی جب پُوربی مالیوں کی مدد سے' سبزی منڈی بھیجنے کے لئے سبزی تڑواتے' بڑی کنجوسی سے ایک ایک گاجر ٹماٹر یا مولی ہمیں دے دیتے جس کے بعد ہنڈکُلیا پکانے کا پروگرام بنا کرتا۔ طاہرہ' رخسانہ اور نجمہ اپنے اپنے گھروں سے گھی' چینی' آٹا وغیرہ چُرا کر لاتے اور منشی جی کی دی ہوئی سبزیوں کی مدد سے ہانڈی روٹی یا حلوہ پوری پکاتے۔ جب بھی روٹیاں پکانے کی باری آتی میں اپنی ٹکیا پکانے کی ضد شروع کر دیتا جواب میں نجمہ میرے سر پر چپت رسید کرتی اور میں اُس کے بال نوچ لیتا پھر ہم دونوں گتھم گتھا ہو جاتے۔ شور شرابا سُن کر عقیلہ باجی آ کر بیچ بچاؤ کراتیں اور میرے کپڑے جھاڑ کر اپنے گھر لے جاتیں جہاں اپنی الماری سے نکال کر گولا' مصری' مکھانے دیا کرتیں اور اچھی اچھی کہانیاں سنا کر مجھے اپنے پاس روک لیتیں۔

ایک دن میری اور نجمہ کی لڑائی کے بعد عقیلہ باجی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اُس وقت میں بپھرا ہوا تھا۔ نجمہ اور طاہرہ درخت سے کچھ توڑ کر چھپ چھپ کر نمک لگاتیں اور ایک دوسرے کو دے دے کر کھا رہی تھیں۔ میرے مانگنے پر نجمہ نے پھر وہی عذر ''لڑکے نہیں کھاتے'' لگا کر مجھے بھگا دیا۔ میں نے جا کر منشی جی سے کہہ دیا کہ نجمہ اور طاہرہ درخت سے کیتھے اور کمرخ توڑ کر کھا رہی ہیں۔ منشی جی نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر خوب کان مروڑے اور دونوں کے ایک ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ طاہرہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور نجمہ کا منہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ مجھے اپنی شناخت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں منشی جی کے پیچھے پیچھے دُم چھلّے کی مانند لگا رہا۔ ظہر کی نماز کے وقت نجمہ کو موقع مل گیا۔ پہلے میری شکایت کا ڈراوا دیا جس پر میں روب میں نہ آیا۔ ''کیوں جی' کیوں جی! میں نے کیا کِیا ہے جس کی تم شکایت لگاؤ گی۔'' ''بچّو جی! تم نے جوتے پہنتے وقت اُن کو ہاتھ لگایا تھا اور ہاتھ دھوئے بغیر سپارہ پڑھا تھا۔ حافظ جی سے کہہ کر خوب چندیا ٹھکواؤں گی۔'' پہلے زبانی بعد میں ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ منشی جی کی غیر حاضری میں عقیلہ باجی کو منصف بننا پڑا۔ جب کسی طور میں عقیلہ باجی کے بس میں نہ آیا تو وہ مجھے کہانی سنانے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ پلنگ پر لیٹ کر عقیلہ باجی نے کہانی شروع کی۔

''راجہ نے بہت سمجھایا' بہت دھمکایا۔ ایک سے ایک بڑے راجے مہاراجے کا رشتہ آنے' طرح طرح کے تحفے تحائف کے تبادلے' بیش قیمت جائیداد' رجواڑے ملنے کی خوشخبری بتلائی۔ راجکماری کے سر پہ ایک ہی دُھن سوار تھی کہ وہ اپنا ور خود چُنے گی۔ اس کا حل راجکماری نے یہ نکالا کہ پورے رجواڑے میں منادی کرا دی۔ فلاں روز پر جا کے تمام نوجوان راجا کے محل کے سامنے جمع ہو جائیں کسی ایک نوجوان کے گلے میں ''ور مالا'' پہنا کر راجکماری اپنا ور منتخب کرے گی۔''

میں نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے مالا کی شکل دے کر اور تصوراتی مالا عقیلہ باجی کے گلے میں پرو دی۔ سارے عمل میں عقیلہ باجی اپنی جگہ پر لیٹی رہیں۔ ہاتھوں کی لمبائی کم ہونے کے باعث میں اُن کے اوپر چلا گیا۔ مالا پہنانے کی کھینچا تانی میں کئی بار عقیلہ باجی کا جوان' کسا ہوا بدن میرے کچے جسم سے ٹکرا کر' گفتگو پر آمادہ ہو گیا۔ ''ہٹو ہٹو' بدتمیز....!'' کہہ کر عقیلہ باجی نے مجھے نیچے دھکیل دیا اور تیزی سے اُٹھ کر کپڑے درست کرنے لگیں۔ مجھے آج بھی عقیلہ باجی کا سرخ رنگ اور اُلجھی لٹیں اچھی طرح یاد ہیں۔

رخسانہ سے جب لڑائی ہوتی وجہ اکلی دُکلی بنتی۔ اُس کی خواہش ہوتی میں اُس کا ساتھی بنوں' بننا میں طاہرہ کا ساتھی چاہتا تھا۔ ایک تو رخسانہ' ایک گھر سے دوسرے گھر میں کودتے ہوئے' توازن برقرار نہ رکھ پاتی۔ دوسرے اُس کا گیٹا پھینکنے کا نشانہ بہت کمزور تھا۔ اکثر اُس کا گیٹا' اکلی دُکلی کے دائرہ سے باہر گرا کرتا۔ یہ سبب رخسانہ کی ہار کا بنتا۔ طاہرہ اور نجمہ کی جوڑی بہت مضبوط تھی اس لئے میری کوشش ہوتی کہ میں طاہرہ کا ساتھی بنوں اور رخسانہ نجمہ کی پارٹنر بن جائے۔

یہی حال جھولا جھولتے وقت ہوتا۔ نیم کے بڑے درخت میں' سن کی رسی کا بڑا جھولا ڈال کر اُس میں لکڑی کا پٹرا رکھا ہوا تھا جس میں ایک ساتھ دو' دو آدمی بیٹھ کر لمبے جھولے لیا کرتے تھے جو آدمی ڈر کر چیخ مارتا اُس کی ہار تصور ہوتی تھی۔ طاہرہ اس معاملے میں بھی بڑی جی دار تھی بھلے ہی جھولا آسمان سے باتیں کرے' طاہرہ کی کبھی چیخ نہ نکلتی۔ اس لئے میں جھولا جھولنے میں بھی طاہرہ کا ساتھی ہوا کرتا کہ مجھے طاہرہ کے ادھ کچرے بدن کی حرارت اور صندلی خوشبو بہت مسحور کرتی تھی۔ رخسانہ کا ساتھی بننے سے جب میں انکار کر دیتا تو وہ چڑ جاتی۔ آہستہ سے میری کمر میں چٹکی لے کر ''چوٹٹا کہیں کا.....!'' جواب میں رخسانہ کے بالوں کو نوچتے ہوئے میں حملہ کرتا! ''کیوں جی کیوں جی میں نے تمہارا کیا چرایا ہے......؟'' ''پرسوں پرلے دن تُو نے لالہ کشن سے سودا لینے کے بعد لُو بھاؤ مانگ کر نہیں کھایا تھا.....!'' ''وہ تو تم نے بھی کھایا تھا بچّو' اور تم جو اپنے گھر سے اُس دن ہنڈکلیاں کے لئے چینی چرا کر لائی تھیں......!''

ایک سبب رخسانہ سے لڑائی کا اور تھا۔ نجمہ کی گڑیا اور طاہر کا گڈا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بیاہ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ رخسانہ کو گڑیا والا کہلانا پسند نہ تھا۔ اُس کا تمام زور اس بات پر تھا کہ میں نجمہ کا بھائی ہوں اس لئے مجھے لڑکی والا ہونا چاہیئے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ میں ہر کھیل میں طاہرہ کا ساتھی بنتا ہوں اس لئے گڑیا گڈے کی شادی میں بھی میں طاہرہ کے ساتھ گڈے والا بنوں گا۔ ایک استدلال' میں اپنا لڑکا ہونا بھی بتلاتا جس پر طاہرہ زور سے ''ہُرّے'' کا نعرہ لگا کر

میرے کلّے پر پیار کر لیتی ''شاباش! بھائی ہو تو ایسا پکّا.....!'' طاہرہ کے پیار کرنے سے میرا جسم سنسنانے لگتا۔ میری کوشش ہوتی کہ میں بات بے بات رخسانہ سے لڑ کر طاہرہ کی توجہ حاصل کروں اور وہ اُسی بے ساختگی سے ''ہُرّے'' کا نعرہ لگا کر میرے کلّے پر گرم گرم لمس کا چٹاک پٹاک کر دے اور میں سارا دن اُس کی سرشاری میں بھیگتا رہوں۔

منشی جی' عقیلہ باجی یا کسی اور سے ہم اتنے تنگ نہ تھے جتنے اپنی مسجد کے اندھے مؤذن ملاّ جی سے تھے۔ نام ملاّ جی کا' کبھی کسی کے منہ سے نہ سنا تھا۔ ہر کوئی ملاّ جی' ملاّ جی کی رٹ لگائے رکھتا۔ بظاہر اندھے ملاّ جی کے نام سے مشہور تھے پر سوانکوں سے زیادہ چنٹ' چالاک اور مکّار تھے۔ صبح اندھیرے گھر سے لاٹھی کے سہارے مسجد چلے آتے۔ سردی ہو یا گرمی مسجد کے غسل خانے مین گھس کر ٹھنڈے پانی سے نہا کر اذان دیںیت۔ ایک مرتبہ ملاّ جی بڑی عجلت میں آئے اور آتے ہی غسلخانے میں گھس گئے۔ جلدی جلدی نہا کر اذان دے کر پلٹے ہی تھے کہ ابّا نے ملاّ جی کے چٹکی لے لی۔ ''ملاّ جی خیریت تو ہے' سردی میں نہانے کی اس قدر جلدی کیا تھی.....؟'' ''شریف میاں کیا بتلاؤں..... کسی کو خواب میں آنے کے لئے دعوت نامہ درکار تھوڑی ہوتا ہے......!''

اشراق کی نماز کے بعد ملاّ جی ہمارے گھر ناشتہ کرنے آتے تھے۔ ہر پہلی کے پہلی مسجد سے پانچ روپیہ تنخواہ لینے کے ساتھ ابّا سے صدقے کے دو روپے لے کر انٹی میں لگا لیتے۔ جب بھی اُن کی بیگم ملاّنی جی' ملاّ جی سے گھریلو اخراجات کی مد میں پیسے مانگنے آتیں' ملاّ جی مسکین صورت بنا کر کہتے۔ ''ہمارے پاس پیسے کہاں سے آئے' ہم تو خود صدقے' خیرات پر گذارا کرتے ہیں۔'' ملاّ جی کی مسکینیت نمازیوں پر چل جاتی تھی بیوی پر اُس کا قطعی اثر نہ ہوتا تھا۔ ''اندھے' مکّار' بہروپیئے' تیرا بیڑا غرق ہو جائے' تجھے کسی پل موت نہ آئے' تیری لاش کو کُتے کھائیں۔ خود تو مسجد میں پڑ کر گل چھرّے اڑا رہا ہے۔ روز کسی غریب مسکین کے نام پر پلاؤ زردہ کھاتے تجھے ہیضہ کیوں نہیں ہوتا' کسی موٹر کے نیچے کیوں نہیں آ جاتا تُو......!'' اُٹھتے بیٹھتے بہادری' شجاعت' مردانگی اور کرامات کی ڈینگیں ہانکنے والے ملاّ جی' مجال ہے! بیگم کی کسی بات پر چُوں چراں کر جائیں۔ چہرے کی رنگت اور ماتھے کی شکنوں میں تغیر و تبدل ضرور ہوتا' زبان سے ایک لفظ اپنی صفائی میں ادا نہ ہوتا۔ اکثر صبح کی نماز کے بعد ملاّ جی کی بیگم وارد ہوا کرتی تھیں جس کے بعد ملاّ جی ہمارے گھر ناشتہ کرنے آتے تھے۔

''آج پھر جھاڑ پڑی ہے کیا......!'' جانتے بوجھتے نجمہ ملاّ جی کو' مزہ لینے کے لئے چھیڑا کرتی۔ ''نہیں بیٹا ایسا تو کچھ نہیں ہے.....!'' ''پھر رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے' آواز بھی بجھی بجھی ہے......!'' ''ارے بیٹا تُو تو جانتی ہے.....! شبراتی خان کا' چالیسواں تھا کل' جوڑا اور پانچ روپے دیئے ہیں اُس کے گھر والوں نے' بس تیری نانی کو کہیں سے بھنک لگ گئی' چلی آئی صبح ہی صبح ملک الموت بن کر.....!'' نجمہ انجان بن جاتی۔ ''ہائے ہائے! اس بڑھاپے میں بے چاری کو بیوگی کا صدمہ سہنا پڑ گیا.....!'' ''نہیں بیٹا! تجھے کس نے کہا وہ بوڑھی ہے' وہ تو سالی مارے جوانی کے لال بھبوکا ہو رہی ہے.....!'' ملاّ جی کے لہجے کی بے شرمی پر نجمہ تلملا جاتی۔ ''ملاّ جی کچھ تو خدا کا خوف کیا کرو' نظر تمہیں آتا نہیں' لوگوں کی بہو بیٹیوں پر اُترتی چڑھتی جوانی دکھائی دے جاتی ہے.....'' نجمہ کی دو ٹوک بندش پر ملاّ جی سٹپٹا کر دھیمی آواز میں کہتے۔ ''بیٹا آواز سے انسان کو سب کچھ سمجھ آتا ہے.....''

شکور صاحب کے پڑوس میں ایک بڑے میاں اور اُن کی بوڑھی بیوی رہا کرتے تھے جس کی شکور صاحب کی نوعمر بیٹی گڈّی سے اکثر لڑائی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن اچانک بوڑھیا فوت ہو گئی اور بڑے میاں کفن دفن کا بندوبست کرنے بوڑھیا کی لاش کو کوٹھری میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ سنا ہے! گھر کے چوہوں نے لاش کی ناک کُتر ڈالی تھی۔ اس واقعہ کے چند دن بعد محلے میں شور پڑا کہ شکور صاحب کی بیٹی گڈّی پر جن آ گئے ہیں۔ نجمہ' طاہرہ' رخسانہ اور میں شکور صاحب کے گھر پہنچے تو شکور صاحب کی بیٹی گڈّی اپنی مرحومہ پڑوسن بڑھیا کے اسٹائل میں اول فول بک رہی تھی۔ غصہ سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ محلے والوں نے فوری طور پر مجھے ملاّ جی کو بلانے بھیج دیا۔ واقعہ کی تفصیل سُن کر ملاّ جی کا رنگ فق ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دھیمے لہجے میں گویا ہوئے ''بیٹا! ہمیں اپنے موکّل کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔''

طاہرہ' رخسانہ' ابرار چھٹی والے دن میرے ہمنوا ہوتے تھے۔ ہر روز ناشتے کے وقت نجمہ ملاّ جی سے اِدھر اُدھر کی باتیں دریافت کرتی تھی' میں سامنے بیٹھ کر مسلسل اُن کی نقل اُتارا کرتا' کبھی کبھی ہاتھ کے اشارے سے بھی چھیڑتا۔ میری اس حرکت کے دوران ملاّ جی اکثر سنجیدہ ہو کر میرا منہ دیکھنے لگتے۔ اُس وقت ملاّ جی کے چہرے پر غصے کی لکیریں واضح طر پر نمایاں ہو کر چہرے کی کرختگی میں اضافہ کر دیا کرتیں۔ جب ہم چاروں مل کر ملاّ جی کی نقلیں اُتارا کرتے' کسی نہ کسی کی ہنسی نکل جاتی' ملاّ جی چونک کر اُسی طرف دیکھا کرتے جس طرف ہنسنے والا موجود ہوا کرتا۔ ایک مرتبہ ملاّ جی کی بیگم کو بک جھک کر گئے تھوڑی دیر گذری تھی۔ طاہرہ مجھے ساتھ لے کر مسجد میں ٹائم دیکھنے گئی۔ سبھی لوگ مسجد کے گھنٹے میں ٹائم دیکھ کر کام چلاتے تھے۔ ملاّ جی اُس وقت' کوئی گیت گنگناتے ہوئے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ٹٹول ٹٹول کر اٹھنّی' چونّی' دونّی' اکنّی' ادھنا' کنگ ایڈورڈ کا بڑا پیسہ' جارج پنجم کا چھوٹا پیسہ اور سوراخ والا پیسہ الگ کر کے گن رہے تھے۔ طاہرہ نے ایک دم چُپ سادھتے ہوئے مجھے بھی قدموں کی آہٹ مدھم کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اُسی ردھم میں چوروں کی طرح چلتے ہوئے چٹایوں کے پیچھے چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ملاّ جی نے پیسے گن کر' کندھے سے رومال اٹھایا۔ اچھی طرح جھاڑ کر رومال کے ایک کونے میں ساری ریزگاری احتیاط سے باندھی اور مسجد کے تیسرے در کی محراب میں دریوں کے نیچے رومال دبا دیا۔ مسجد کے درمیان والے دروازے میں ملاّ جی تالا ڈال کر جیسے ہی گئے میں نے اور طاہرہ نے' ملاّ جی کے پیسوں والے رومال کو اُڑا لیا آہستہ سے پہلے سرے کے دروازے جہاں میں اور طاہرہ چھپے ہوئے تھے کا کُنڈا کھول کر ہم دونوں باہر آ گئے۔

''کسی کو کہے گا تو نہیں.....!'' میں نے نفی میں سر ہلایا' طاہرہ نے مجھے بازوؤں میں تھام کر زور زور سے میرے دونوں کلّوں پر گرم گرم چٹاک پٹاک کر ڈالی۔ جلدی سے طاہرہ نے ملاّ جی کا رومال کھول کر ایک ادھنّا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''جا بھاگ کر' کشن سے دو پیسے کی املی لے آ'' جیسے ہی

میرا قدم لالہ کشن کی طرف بڑھا' طاہرہ نے آواز دے کر ایک ادھنّا اور میری طرف اچھالتے ہوئے کہا ''دو پیسے کی ٹاپی بھی لیتا آیو' تینوں مل کر کھائیں گے۔ سیدھا میرے گھر آیو کبھی اُس کلّو پری کے گھس جائے'' اشارہ رخسانہ کی طرف تھا۔ میرے ہاتھ میں املی اور نمک دیکھ کر نجمہ خوشی سے بولی ''اللہ توبہ.... !تم دونوں پورے ڈاکو بن گئے ہو' کسی کو پتا لگ گیا تو بہت بُرا ہوگا۔'' ''کچھ نی ہوتا' کچھ نی ہوتا' یہ پیسے ملاّ جی کے کب ہیں..... !یہ تو مسجد کے تیل کے پیسے ہیں جو غریب لوگ منتیں مرادیں پوری ہونے کی آس میں ملاّ جی کو تیل کے لئے دیتے ہیں...... !'' طاہرہ نے کلّن قوال کی طرح ہاتھ نچا کر نجمہ کو تسلّی دی اور زبان دانتوں سے باہر نکال کر املی کھانے لگی۔ جیسے ہی میں نے املی کی طرف ہاتھ بڑھایا نجمہ نے میرے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا.... !''اسے دیکھو کتِنا گھنّا ہے یہ' بات بے بات میری شکایت لگاتا رہتا ہے اب کیسا میمنا بنا بیٹھا ہے۔ بچّو جی.... !اب اگر تم مجھ سے لڑے تو میں ابّا سے تمہاری شکایت لگا کے رہوں گی۔'' لفظ شکایت پر طاہرہ بھڑک گئی۔ ''بڑی بے شرم ہے تُو' کھائے بھی جا رہی ہے غرّائے بھی جا رہی ہے۔ خبردار..... !جو تُو نے میرے بھائی کو ڈراوا دیا ورنہ کُٹّی ہو جائے گی تیری میری۔ طلاق دلوادوں گی تیری گڑیا کو اپنے گڈّے سے۔'' ''چل چل بڑی آئی طلاق دلوانے والی' گردن نہ مروڑ دوں گی تیرے گڈّے کی۔''

تنگ ملاّ جی ہم چاروں سے پہلے بھی بہت تھے۔ بقول اُن کے ہم چاروں نماز کے وقت بھی ہنسی ٹھٹھا بند نہیں کرتے۔ گلّی' پتنگ' گیند وغیرہ جوتے اُتارے بغیر مسجد میں لینے گھس جاتے ہیں۔ حمام کا پانی ختم کر دیتے ہیں۔ ملاّ جی کے پاس تعویز گنڈوں کے لئے آنے والوں کو چھیڑتے' اُن پر آوازیں کستے ہیں۔ نمازیوں کے جوتے ادھر اُدھر کر دیتے ہیں۔ جب بھی کوئی نمازی اپنا جوتا تلاش کرتا ہے' دوسرا پیر اُسے کسی اور کے جوتے کے ساتھ ملتا ہے۔ ملاّ اشرف' نواب باجے والا' نذیر ماشکی' حاجی عبدالعزیز اور نیتا جی کو مختلف ناموں سے چھیڑتے ہیں۔

ملاّ اشرف ضعیف اور بیمار آدمی تھے۔ اُن کا کُب نکلا ہوا تھا۔ نماز کے دوران اکثر اُنہیں نیند آ جاتی تھی۔ سارے نمازی سجدے سے قیام میں آ جاتے تھے وہ سجدے میں پڑے سوتے رہتے تھے۔ ہم چاروں نے ملاّ اشرف کا نام بگلا رکھا ہوا تھا۔ جب ملاّ اشرف اکیلے مسجد میں داخل ہوا کرتے' ہم چاروں میں سے کوئی گلے سے مختلف قسم کی آواز نکال کر بگلا' بگلا کی صدا لگا دیتا جواب میں ملاّ اشرف مسجد کے احاطے میں کھڑے ہو کر اول فول بکنے لگتے۔

نواب باجے والے کا رنگ اس قدر کالا تھا کہ کوّا بھی شرمائے۔ داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ہفتہ ہفتہ شیو نہ بنانے کے باعث ایسا لگتا تھا کہ نواب باجے والے نے آدھے منہ پر چُونا پھیرا ہوا ہے۔ ازار بند باقاعدگی سے نواب باجے والے کا لٹکا ہوتا تھا۔ طاہرہ کی تجویز پر ہم سب نے نواب باجے والے کا نام' افریقی سانڈ رکھا ہوا تھا کہ اُن کی صحت اچھی ہونے کے علاوہ توند بھی لٹکی ہوئی تھی۔ نذیر ماشکی کی آواز ناک سے ہو کر گذرتی تھی۔ ایک آنکھ میں پھُولا موجود تھا۔ مخمل کی کالی ٹوپی میلی چکٹ ہو کر سُرمئی' سلیٹی اور بھوری ہو چکی تھی۔

اُسے ہم سارے اینچی کہہ کر چڑاتے تھے۔ حاجی عبدالعزیز مسجد کی انتظامی کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ انگریز کے زمانے کے ہیڈ بیرے ہونے کے باعث پینشن ملتی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے ملنے والے پیسے کو اُنہوں نے سائیکل کی دکان میں لگایا ہوا تھا جس سے معقول آمدنی ہو رہی تھی۔ رنگ کالا ہونے کے باوجود کپڑے صاف ستھرے پہنتے تھے۔ سر پر کُلّا اور صافہ باندھتے تھے۔ بات بے بات' ڈانٹنا' ڈپٹنا' جھڑکنا اُن کا وطیرہ تھا۔ متفقہ طور پر ہم نے اُنہیں خشکے کے خطاب سے نوازا ہوا تھا۔ اُن پر آوازیں کسنا یا چھیڑنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ پیٹھ پیچھے کھلے عام' چاروں اُنہیں خشکا کہہ کر پکارتے تھے۔

نیتا جی کا اصلی نام وحید تھا۔ کانگریسی ہونے کے باعث کھدّر کے کپڑے اور گاندھی کیپ پہنا کرتے تھے۔ سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے مگر سیاست کے علاوہ کوئی کام کاج بالکل نہ کرتے تھے۔ ہولی' دیوالی' عید' بقر عید سب جوش خروش سے مناتے تھے۔ پورے سال وہ مسجد میں دکھائی نہ دیتے جیسے ہی رمضان کا چاند دکھائی دیتا فوراً تراویح پڑھنے آ جاتے۔ بظاہر ان کی کوئی چھیڑ تو ہم نے نہ رکھی تھی البتہ! اُن کو دیکھ کر ہمارے گلوں کی خراش عود کر آتی۔ بلاوجہ ہر کوئی اُنہیں دیکھ کر کھُوں کھُوں' کھُوں کھُوں کرنے لگتا تھا۔

ملاّ جی کے جب سے پیسے غائب ہوئے تھے۔ ہم لوگوں پر اُن کا غصہ کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ پیسوں کی بابت ذکر کر کے بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑتا تھا لہٰذا ملاّ جی' شرارتوں کو جواز بنا کر' ہمارے گھر والوں سے ڈانٹ پڑواتے رہتے۔ حاجی عبدالعزیز کو بھی موقعہ بے موقعہ بھڑکانے سے باز نہ آتے۔ جب سے ہندوستان کی تقسیم کا شور اُٹھا تھا تب سے ملاّ جی زیادہ چڑچڑے ہو گئے تھے۔ نماز سے پہلے' نماز کے بعد ٹولیوں کی شکل میں نمازیوں کی میٹنگ ہوا کرتی۔ سب لوگوں کو اس بات پر تشویش تھی کہ پاکستان بن گیا تو ہماری مسجد کا کیا ہوگا۔ علاقے میں مسلمانوں کے گنے چُنے گھر ہیں۔ ہندو' سکھ آبادی اکثریت میں ہے۔ پاکستان بننے کی صورت میں مسلمانوں کا یہاں رہنا ناممکن تھا۔ لوگ باگ ادھر اُدھر جا سکتے تھے۔ مال واسباب سیٹا جا سکتا تھا۔ مسجد کی عمارت کا کوئی حل کسی کے ذہن میں نہ آتا تھا۔

''ملاّ جی! کیا سوچا ہے تم نے..... !میرا باجا تو پاکستان میں بھی بج سکتا ہے' تمہاری سارنگی کا کیا ہوگا.... تم ڈانگ سوٹا لے کر کہاں سماؤ گے..... ؟'' پچیس بیڑی کے تین مینار مارکہ بنڈل کا کاغذ اوپر سے پھاڑتے ہوئے نواب باجے والا سوال کرتا تو ملاّ جی کی اندھی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگتے۔ ''میاں! مجھے تو مسجد کی فکر کھائے جا رہی ہے..... چاروں طرف ہندو سکھ بھرے ہوئے ہیں...... اللہ ہی حفاظت کرے گا اپنے گھر کی...... !''

کچھ دنوں سے' عقیلہ باجی کے گھر منشی جی کی صدارت میں' کبھی پیشکار صاحب کے گھر اُن کی رہبری میں' ہمارے بڑوں کی میٹنگوں کا رواج پڑ گیا تھا۔ دونوں حضرات دیگر بڑوں کی نسبت پڑھے لکھے' بردبار' دوراندیش سمجھے جاتے تھے۔ پیشکار صاحب سرکاری نوکری کی وجہ سے خاصے پُراُمید تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کے حق میں رائے دے کر' فوج کی نگرانی میں چلنے والی سپیشل ٹرین کے ذریعے پاکستان جا کر' نوکری برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اپنے حق میں پیشکار

صاحب پاکستان میں جلدی ترقی کی دلیل بھی جوش و جذبے کے ساتھ دیا کرتے تھے۔ منشی جی کا کہنا یہ تھا کہ میں نواب صاحب کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ آزادی سے نہیں کر سکتا۔ نواب صاحب کو جاگیر کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ آبائی قبرستان کی بابت بھی نواب صاحب تشویش میں مبتلا ہیں۔ زبان و بیان' رہن سہن کا فرق بھی نواب صاحب کو گومگو میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ طاہرہ کا خاندان' زرعی زمینوں سے دستبرداری پر تیار نہیں تھا۔ وہ لوگ پاکستان بننے کی صورت میں شہر چھوڑ کر گاؤں منتقل ہونے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ شکور صاحب کا کہنا تھا ''میاں! ہم تو مزدور آدمی ہیں۔ یہاں بھی رندا چلا کر روٹی کماتے ہیں' پاکستان میں بھی خون پسینہ ایک کر دیں گے۔'' آفتاب خان نل والے پہلے ہی سامان باندھے تیار بیٹھے تھے کہ اُن کا آبائی تعلق علاقہ غیر سے تھا۔ مجید لوہار کے بیٹوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ حنیف کا ووٹ پاکستان کے حق میں تھا' صغیر ہندوستان چھوڑ کر اپنی سسرال سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ صغیر کے سسرال والوں کا بس باڈی میکنگ کا کاروبار تھا بہت پیسے والے تھے۔ پاکستان جانے کی صورت میں صغیر کو بیوی کے حصے سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ رشید نے البتہ! باگ ڈور باپ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اُس کا کہنا تھا! ''جو فیصلہ ابّا کرے گا میں اُس پر عمل کروں گا۔'' رشید کی مجبوری یہ تھی کہ دو چھوٹے بچوں اور بیمار بیوی کو لے کر اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا۔ نیتا جی کی طرح لطیف نائی کو انگریزوں سے ابھی بھی امید تھی۔ اُس کا کہنا یہ تھا ''یہ آزادی وزادی سب ایک ڈرامہ ہے۔ ہندوستان' انگریز سرکار کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ کالے لوگ حکومت کرنا جانتے ہی نہیں۔ اُن کی فطرت میں حکم بجانا ہے۔'' بابو ولی محمد اور بابو فرزند علی نے حتمی طور پر انڈیا کے حق میں ووٹ دے دیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اپنا گھر' دکان اور گاؤں کی زمین چھوڑ کر جانے پر تیار نہ تھے۔ اُن کے خیال میں پتھر اپنی جگہ چھوڑ کر' وزن کھو بیٹھتا ہے.....! مولوی تقی باقاعدگی سے پاکستان کے حق میں اور ہکلے حکیم انڈیا کی فیور میں راہ ہموار کر رہے تھے۔ دونوں بالترتیب مسلم لیگی اور کانگریسی تھے۔ ہمارے تایا نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے دیا تھا۔ ابّا کی کیا مجال کہ وہ بڑے بھائی کے مخالف آزادانہ فیصلہ کرتے۔ تایا کے کہنے پر ابّا نے دفتر میں پاکستان کے حق میں نام لکھوا دیا تھا۔ جھگڑو گھوسی' نور جہاں آپا اور اُن کے شوہر حمید پہلوان کا ہندوستان' پاکستان میں سے کسی ایک طرف رجحان کا کبھی پتا نہ چلا سنتے سب کی کرتے اپنے من کی۔ آخری وقت تک سارے پڑوسی' محلّے دار اُن کی بابت بے خبر ہی رہے.....!

اُن دنوں ہمارے ابّا خلاف توقع بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ بات' بات پر نجمہ پر بگڑنا' میری گوشمالی کرنا' محلے والوں سے دور رہنا' اکثر نمازیں گھر میں ادا کرنا' دفتر سے لمبی لمبی چھٹی لے لینا۔ بلاسبب' شاہ ولایت' شاہ پیر اور حاجی صاحب کے مزاروں پر جانا۔ اس سے قبل جمعرات کے جمعرات کبھی شاہ ولایت کبھی شاہ پیر کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جایا کرتے تھے۔ حاجی صاحب کے مزار پر سال کے سال اُن کے عرس کے موقع پر جانا ہوتا تھا۔ دونوں جگہاؤں پر مدفون بزرگوں کی قبروں کی دیکھ بھال میں شدّت آ گئی تھی۔ بھومیا کے پُل والے پیر صاحب کے پھیرے بڑھ گئے تھے۔ طرح طرح کے پھولوں اور عطر کی خوشبوؤں سے جی بہلانے لگے تھے۔ ریڈیو پر قوّالی بہت شوق سے سننے لگے تھے۔

ہمیں تو لُوٹ لیا مل کے حسن والوں نے
کالے کالے بالوں نے' گورے گورے گالوں نے

جب بھی یہ قوّالی ریڈیو پر بجتی ابّا گہری سوچوں میں گم ہو جاتے۔ اُن کی آنکھوں کی منڈیروں پر تری صاف دکھائی دینے لگتی۔ ایک فلمی گانا بھی اُن دنوں ابّا شوق سے سنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تنہائی میں اس گانے کو گنگنایا بھی کرتے تھے۔

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

گھر سے چلتے وقت' دل میں بہت سے ارمان.... ! آرزوؤں' اُمنگوں' اِچھاؤں اور خوش اُمیدیوں کے' ہم سے دو قدم آگے ہمارے ہمراہی بن کر' پرانے نقشوں میں' من پسند رنگ بھرنے کی ترنگ میں خوشی سے جھومتے' لہراتے' بل کھاتے' چلے جا رہے تھے...... ! اُن کے لے میں' کھیت' کھلیان' پھل پھول' پودے' چرند' پرند سب مل کر خوشی کے گیت گا رہے تھے......! وقت کی پانچ دہائیوں کا گھوڑا جس منہ زوری سے بچپن' نو جوانی' جوانی نگل کر سرپٹ دکھلا چکا تھا اُس کا ہمیں قطعی احساس نہ تھا.....!

ایک پتھر.....! ایک نادیدہ پتھر کی ضرب نے.....! آرزوؤں' ارمانوں' اُمنگوں' اِچھاؤں اور خوش اُمیدیوں کے رنگ کی پٹاری..... ہوا میں اس طرح بکھیر دی جس طرح خزاں رسیدہ پتے' درخت سے خوراک نہ ملنے کے باعث' بے گھر' بے در' ہو کر کسی دوزخ کا ایندھن بننے پر مجبور ہوتے ہیں.....!

پرانے نقشوں کو نئی زندگی بخشنے والے' بے پناہ طاقت اور قوت کے بل پر' اپنی پسند کا رنگ' ان خستہ حال نقشوں میں یقیناً بھر لیں گے.....! اپنے ن کی مراد بھی لازماً پا لیں گے.....! مگر.....! اُن خستہ تر نقشوں کی شکستگی کس طرح دور ہو گی جن کے ارمانوں کا گلشن اُجڑ کر بیاباں بن چکا ہے.....! جن کے چہرے کی کشش' اجنبیت کی بھیڑ میں جھلس چکی ہے.....! جن کی دودھیا رنگت گدلا چکی ہے.....! جن کی شربتی آنکھیں حسرت و یاس کی تصویر بن چکی ہیں.....! جن کے سیاہ اور گھنے بال وقت کی دھول سے اٹ چکے ہیں.....! جن کے گلابی ہونٹ' سیاہی کا اشتہار بن چکے ہیں.....! جن کا نکلتا قد' آلام کے پاٹوں میں دب چکا ہے.....! جن کا چھریرا بدن' سوکھی چھڑی میں تبدیل ہو چکا ہے.....! جن کی شرارت اور چلبلاہٹ' ماتم کا روپ دھار چکی ہے.....! جن کی ٹھوڑی کا تل' کچھ اور نمایاں ہو کر' گئے دنوں کو آواز دے رہا ہے.....! جن کے دانتوں کی جھری اور عیاں ہر کر وقت کو' کوس رہی ہے.....!

ہے کوئی محاورا.....! دلیل.....! کہاوت.....! جو اس کڑے وقت میں ایک عالمی اعزاز یافتہ' مہذب' مؤدب' بلند نگاہ' وسیع المشربی کے داعی اہل قلم کو تقویت بخش دے.....! اس کی گنگ زبان کو گویائی کی شکل میں' ایسے الفاظ عطا کر دے کہ وہ.....! گذشتہ پانچ دہائیوں کی محرومی کے ازالے کے ساتھ.....اس کڑے وقت کی لاج رکھ سکے.....!!!

●●

بے سِمت راستوں کے مُسافِر

قیوم خالد

وہ تیزی سے سارے منظر سمیٹنے لگا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ منظر ساتھ نہیں جائیں گے۔ اُس کے ساتھ اگر کوئی چیز جائے گی تو وہ ایک اتھاہ تاریکی ہوگی جس میں ہر منظر کھو جائے گا۔ ہر رنگ بے رنگ ہو جائے گا۔ پھر بھی وہ منظر سمیٹ رہا تھا۔

اُس نے ایک سمت نظر ڈالی۔ ایک وسیع منظر اس کے نگاہوں میں سِمٹ آیا۔ ایک بہت بڑی سبز و شاداب وادی تھی۔ ہری بھری پہاڑوں کی چوٹیاں تھی۔ ہر طرف پُھول کِھلے ہوئے تھے۔ سُورج بھی اپنے پُورے آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہر طرف گیس کے ہنڈولے لٹکے ہوئے تھے کہ اگر سُورج ساتھ دینے سے اِنکار کر دے تو اُس کا مُقابلہ کیا جا سکے۔

کچھ لوگ اِن حسین مناظر کا لُطف اُٹھا رہے تھے۔ اُن کے لِباس صاف سُتھرے اور قیمتی تھے۔ شائد اُن لوگوں نے وہاں تک کا سفر دُوسروں کے کاندھوں پر بیٹھ کر طے کیا تھا یا پھر وہ وہیں پیدا ہوئے تھے۔ وہ لوگ سبزہ سے ڈھکی ہوئی وادی کے وارث تھے۔ اُن میں سے بعض لوگوں میں اتنی رعونت تھی کہ بات بھی کریں تو لگتا تھا آپ کے مُنہ پر تُھوک رہے ہیں۔

کُچھ اور بھی لوگ وہاں موجُود تھے۔ وہ لوگ بہت عُجلت میں تھے وہ سُورج کی کِرنوں سے اپنے کپڑے رفو کرنے میں مصرُوف تھے اُن کی کوشش تھی کہ کام جلد ختم ہو اور وہ بھی مناظر کا لُطف اُٹھانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی جدو جہد سے اُس شاداب وادی تک پہونچے تھے۔ راستے کے پیچ و خم کو اپنے قدموں سے زیر کیا تھا۔ اُس وادی تک جانے والی پگڈنڈی خاردار اور تنگ تھی۔ اُس پر چلنے کے لئے کانٹوں پر پاؤں رکھنے کا حوصلہ بہت ضروری تھا۔

ہر ایک کے تصّور میں بسی ہوئی جو منزِل ہے وہ یہی ہو سکتی ہے۔ میں بھی کاش وہاں تک پہونچ پاتا۔ اُس نے سوچا۔

اُس نے دُوسری طرف نگاہ ڈالی ایک دوسرا منظر اُس کا مُنتظر تھا۔ ایک وسیع ریگ زار تھا۔ ان گِنت مِٹیالے رنگ کے پہاڑ اور بنجر ٹیلوں کا اک سلسلہ تھا۔ ایک زرد سا سُورج پہاڑوں پر اپنے ہاتھ ٹیک کر اپنے زوال کا مُقابلہ کرنے حوصلے سمیٹ رہا تھا۔

اُن ٹیلوں اور پتھروں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پیروں میں چھالے پڑے ہُوئے تھے اور اُن چھالوں کے عکس آنکھوں میں کراہ رہ تھے۔ درد کی تاب نہ لا کر وہ اپنے چھالوں کو پھوڑ دینا چاہ رہے تھے۔ لیکن اُن کے ہاتھ خالی تھے نہ ہی حوصلوں کے نشتر اُن کے پاس تھے اور نہ ہی کوئی مرہم تھا۔ چہروں پر تھکن مکڑی کے جالوں کی طرح تنی ہوئی تھی۔ پاس ہی اَن گِنت چراغ رکھے ہوئے تھے جو ہواؤں کی زد پر تھے۔ اُن میں سے بیشتر چراغ بُجھے ہوئے تھے جیسے ہوا نے اپنا راز افشاں کرنے کے جُرم میں اُنہیں خاموش کر دیا ہو۔

اُس نے نِگاہ پھیر لی اور اُس سِمت دیکھنے لگا جہاں سے وہ چلا تھا۔ اُس کے ساتھی ابھی تک اُس بوسیدہ فصیل کے سائے میں پناہ لئے بیٹھے تھے اور دیوار سے جھڑتی ہوئی مِٹّی کھانے میں مصرُوف تھے۔ وہ دیوار سے اِتنے چِمٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محرُوم ہو چُکے تھے۔ حالانکہ دیواروں پر جو کچھ لکھا ہوتا ہے چاہے وہ محبت ہو کہ نفرت' وہ سچ ہوتا ہے۔ اُس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی کوئی تصّنع نہیں ہوتا۔ اُن کی ویران آنکھوں میں کوئی خواب نہ تھا۔ دیوار خمیدہ ہوگئی تھی اور اُس کے اوپر کچھ لوگ سوار تھے جو اُن لوگوں کی اِس حالت زار کو دیکھ کر ہنس رہ تھے۔ ایک وقت تھا کہ فصیل کے اُس طرف کا علاقہ بھی اُن لوگوں کا تھا لیکن اب اُس پر دوسرے لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اُن لوگوں کو دیوار سے لگی ہوئی خندق میں ڈھکیل دیا تھا۔ اور دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اُن میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کی پوشاکیں اُجلی تھیں اور دانت چاندی کے تھے اور ہونٹوں پر لالی تھی اور یہ لالی پان کی نہیں تھی۔ اُن لوگوں کا اصرار یہی تھا کہ وہ لالی پان ہی کی ہے۔ پان اُن کی تہذیب کا حصّہ ہی نہ تھا وہ تو نیم کے کڑوے داتن کے عادی تھے۔ اُجلی پوشاک والے کوئی چیز چبا چبا کر دیوار پر سوار دوسرے ساتھیوں کے منہ میں ڈال دیتے تھے جسے وہ لوگ مرغوب غذا کی طرح کھا رہے تھے۔ وہ لوگ بُری طرح دیوار پر سوار تھے اور اُسے یقین تھا کہ وہ لوگ اُسے فرش کر دیں گے۔ اسی انکشاف نے اُسے دیوار کا سایہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اُس نے حیرت سے خندق میں پڑے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ نہ جانے یہ لوگ ابھی تک کِس طرح دِیوار سے چِمٹے ہوئے ہیں۔ یہ آ گہی بھی کِتنا مُہلّک زہر ہے۔ ایک بار اُسے پی لینے کے بعد تِیر گی کو اُجالا اور دھوپ کو چھاؤں کہنے کی کوشش کرو تو زبان کٹنے لگتی ہے۔ وہ بھی یہ زہر پی چکا تھا۔ اُسے پینے کے بعد ہی وہ دیوار کے سائے میں بیٹھ نہیں پایا تھا۔ ایک احساس کہ وہ لوگ دیوار کو ڈھا دیں گے' رفتہ رفتہ یقین بنتا گیا اور پھر یہ فیصلہ کئے بغیر کہ کہاں جانا ہے اُس نے وہ سایہ چھوڑ دیا۔ شائد وہ فیصلہ کر بھی لیتا اور منزل کو پا لیتا لیکن اُسے اپنے حواس تک درست کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی' اُف...... خوفزدہ ہو کر اُسنے چوتھی طرف نظر ڈالی۔ وہ اس طرف سے اپنی آنکھیں بند رکھنا چاہتا تھا لیکن ایک خوف بار بار اُسے اُدھر دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ بھیانک اژدھا اب بھی تیزی سے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس کے سُرخ آنکھوں میں اندھے اِنتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ہر قسم کی تفریق کی صلاحیت سے محروم اِنتقام۔ بار بار وہ

زبان لپلپاتا تو بجلی سی کُوند جاتی۔ غُصّہ کی شدّت سے وہ پھنکار رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر اژدہے کی طرف دیکھا اور زمین پر سے اپنے جسم کو اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اُسے لگا کہ پاؤں من من بھر کے ہوگئے ہیں اور جسم کا ایک ایک جوڑ درد کر رہا ہے' بے بسی اور خوف سے اُس کی آنکھیں بند ہوئیں جا رہی تھیں۔ کُچھ دیر میں اژدھا اُس کے سرہانے پہونچ گیا۔ اور اُس سے کھیلنے لگا۔ بس ایک لمحہ اور ہے اُس کے بعد ایک آگ میرے جسم میں اُتر جائے گی اور میرا سارا خون پی جائے گی۔ اُس نے سوچا "شائد یہ میرے قتل کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں دہشت کے مارے مر جاؤں اور وہ اس الزام سے بچ جائے۔ اُس نے تیزی سے چاروں طرف ایک آس بھری نظر دوڑائی کہ شائد کچھ مدد مل جائے اور اُسے اژدھے سے نجات مل جائے۔ شاداب وادی والے لوگ حسین مناظر میں گُم اور اپنے ہی خیالوں میں مگن تھے۔ بے حسی اُن کی سرشت تھی۔ کچھ کو تو اپنے چاک رفو کرنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ بنجر ریگ زار والوں کی نگاہوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بچانے کی کوئی بھی کوشش اُنہیں بھی اسی عذاب میں مُبتلا کردے گی۔ اژدھا اُن سے بھی ضرور اِنتقام لے گا۔ وہ بے بسی سے ایک دُوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بوسیدہ دیوار سے جھڑتی ہوئی مِٹّی کھانے والوں میں اِتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ مدد کرنے یا مُقابلہ کرنے کے بارے میں سوچ سکیں۔ تِینوں طرف سے مایوس ہوکر اُس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ یہ اژدھا اب مجھے مار ڈالے تو اچھا ہے۔ اذِیت کے احساس سے تو نجات تو مل جائے گی۔ اژدھا بدستور اُس سے کھیلتا رہا۔ خوف اُسکے دل میں زخمی کبُوتر کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اُس نے بے چین ہوکر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی نظر ایک لاٹھی پر پڑی جو صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک بار بچاؤ کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ اُس نے سوچا ساتھ ہی ایک خوف سانپ کی طرح اُس کے ذہن میں لہرایا۔ میں کلیم نہیں ہوں کیا پتہ وہ لاٹھی بھی میرے حق میں اژدھا بن جائے۔

"اژدھے تو دو ہو سکتے ہیں لیکن موت تو ایک ہی ہوگی۔" یہ خیال اُس کی شریانوں میں دوڑنے لگا۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے اُسنے سوچا اور ہاتھ بڑھا کر لاٹھی کھینچ لی۔ پھر کسمسایا اور اپنا بدن گرفت سے آزاد کر کے اژدھے کے سر پر پوری قوّت سے لاٹھی دے ماری۔ اژدھا زخمی ہوکر گر پڑا اور اپنی جان کو خطرہ دیکھ کر اُس پر حملہ کر دیا۔ اک آگ اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ وہ چکرا کر گر پڑا اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی قوّت لمحہ لمحہ گھُٹتی جا رہی ہے۔ بڑی مُشکِل سے اپنی آنکھیں کھولیں اب اُس کے اطراف ایک ہجُوم تھا۔ اُن میں اُس کے شناسا بھی تھے اور اجنبی بھی۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ اس کے ایک دوست نے جو دیوار پر سوار لوگوں میں شامل تھا اس کا ہاتھ تھام کر رقّت آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔ "کاش تُم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کم از کم تُمہارا یہ انجام نہ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ کیوں کہ چاندی کے دانتوں والے نے کوئی چیز چبا کر اُس کے منہ میں اُنڈیل دی تھی۔

"روزانہ ملتے رہنے کے باوجود کُچھ کہنے کی ضرورت دوستی کی توہین ہے۔ ہماری دوستی ایک سُراب تھی جو میری پیاس نہیں بجھا سکتی تھی اور میرے انجام کی ......فکر مت کرو......تُمہارا انجام اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اک نہ اک دن تم بھی اندھے اژدھے کی گرفت میں آجاؤ گے تب وہ تُم سے بھی مروّت نہیں کرے گا"۔ اُس نے کہنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ قوّت گویائی کھو چکا ہے۔ وہ بے بسی سے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ بنجر ریگ زار والے اُس سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ وہ لفظوں کے معاملہ میں ہمیشہ تہی دست تھے۔ جو دل میں تھا اُسے کبھی زبان پر لا نہ سکے۔ چاندی کے دانتوں والا ایک شخص کچھ کہنے کے لئے لفظ اِکٹّھے کر رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اُس کی بات کل کے اخبار کی زینت بن جائے اور لوگ اُس کا شُمار بھی ہمدرد اور غم گُساروں میں کریں۔ وہ جانتا تھا کہ چاندی کے دانتوں والا اُس گروہ کا سرغنہ ہے جو جب جی چاہے دوسروں کے گھر جلا کر دیوالی اور دُوسروں کے خُون سے ہولی کھیلنے کے عادی تھے۔ اُس کے ساتھی اب بھی کہیں نہ کہیں اپنے کام میں مصروف تھے۔

اُس نے چاہا کہ اپنے آلُودہ ہاتھوں سے اُس کا دامن پکڑ لے۔ اُس کے اُجلے دامن کو داغ دار کر دے تا کہ اُسکی بے زبانی کو زبان مل جائے۔ لوگ اُن داغوں کو پڑھ لیں اور اُسے پہچان لیں۔ آنے والی نسل کو چبائے ہوئے نوالے کھانا نہ پڑے۔ اُس کے چاروں طرف ایک شور تھا۔ شور کے اس حِصار سے اُسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ زندگی کے آخری لمحے پُرسُکون ہوں۔ اُسے آوازوں سے نفرت ہو چُکی تھی۔ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آوازوں نے اُس کے فیصلوں کو بے سِمتی بخشی تھی۔ اب آخری لمحوں میں تو یہ لفظ عذاب بن گئے تھے۔ اُن سے چھُٹکارہ پانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے سوچا اور پھر اپنے زخموں کا مُنہ اُن لفظوں کے سامنے کر دیا۔ یکا یک سارے لفظوں کے آہنگ پگھل گئے۔ سارے چہرے ایک تاریکی میں کھو گئے اور اُس نے دِھیرے سے اپنی آنکھیں مُوند لیں۔

●●

حیات مبارکہ حیدر

حیدر قریشی

اگست ۲۰۱۹

قیمت انڈیا میں: دوسو روپیے

رابطہ

hqg786@gmail.com

whats App

00491521950522

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

ڈاکٹر جی۔ ایم ۔ پٹیل -پونہ

میں مدثر صدیقی ظہیر آباد سے کچھ میلوں کی دوری پر واقع ایک قصبے میں ستمبر، ۱۹۴۸ء کے پولس ایکشن کے قتلِ عام کا ایک مظلوم۔ معصوم، نہتے اور بے قصور انسانوں کے قتلِ عام کا وہ خوفناک منظر میری آنکھوں میں میرے دل و دماغ میں ایک ناسور ایک رستہ آبلہ بنے نقش ہوگیا۔ میری نظروں کے سامنے خونخوار درندوں کا ہجوم اپنے ہاتھوں میں ننگی تلواروں کو لہراتے چیختے ، چنگھاڑتے نعروں کی گنج کے ساتھ مکان میں گھُس گیا اور جتنے افراد وہاں موجود تھے میری ماں، میرے والد، میرا بھائی میری بہن، معصوم بچے ان تمام کے سروں کو بڑی بے دردی، بے رحمی سے، شقاوت اور سفاکانہ طور سے ذبح کیا، کاٹ ڈالا اور تمام بدن لہو میں نہائے گھر کی چاروں طرف تڑپتے، تھرتھراتے کانپتے زمین پر بکھر گئے ۔ انکے سروں کو اپنی تلوار کی نوک پہ لٹکائے نشہ اور مدہوشی کے عالم میں جشن مناتے ان ادھ مری خون میں لُت پُت تڑپتی ، بلکتی ، کراہتی لاشوں کو کچلتے پھلانگتے بے تحاشہ دوڑتے وہاں سے نکل گئے۔ میں مارے خوف کے کانپتا وہیں قریب ایک آسرے میں چُھپا رہا کچھ وقفہ بعد موقعہ پا کر اپنی جان مٹھی میں لئے بے تحاشہ دوڑتا رہا میری چاروں طرف خون میں لُت پُت ادھ مری تڑپتی، زندگی سے پناہ مانگتی زندہ لاشیں، انسانی لہو سے لبالب گندی نالیاں، آہ وفغاں، آہیں، کراہٹوں نے سارے ماحول کو حشر کا میداں بنا دیا۔ آخر تھک کر بستیوں سے کافی دور ایک کھنڈر نما عمارت کے گوشے میں چھپا رہا۔ اچانک تیز طوفانی ہوائیں ، دلخراش بجلیوں کی گرج و گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیز

طوفانی بارش نے ان تمام ادھ مرے انسانوں کو انکی تڑپ ، انکی کراہٹوں کو خود میں جذب کرلیا ژالاباری نے لاشوں کو ٹھنڈی تہہ میں لپیٹ لیا۔ اب چاروں طرف خاموشی اور سنّاٹا۔ صبح کی مدھم روشنی میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں ایک بھلے مانس نے اپنی بیل گاڑی میں مجھے ایک شال میں لپیٹے وہیں خاموش لیٹنے کی تاکید کی اور کئی میل کے سفر کے بعد ایک محفوظ جگہ چھوڑ دیا۔ اب میں اپنے شہر سے کوسوں دور کسی اور شہر میں بس گیا تھا۔

میکانکل انجنیر نگ کا آخری سال مکمل کرنا تھا۔ محنت مزدوری جدو جہد دن رات ایک کردئے ۔ کامیاب ہوا اُسی شہر میں نوکری حاصل کرلی ۔ کچھ عرصہ بعد عراق کا اشتہار دیکھا، عرضی دے دی اور مجھے چُن لیا گیا اور میں عراق پہنچ گیا اور ایک کار کمپنی میں بطور میکانکل انجنیئر اپنا کام شروع کیا۔

میرے عراق پہنچنے کی خبر ہوا کی طرح میرے اپنے وطن، میرے شہر پہنچ گئی۔ جو رشتہ دار وہاں زندہ بچ گئے تھے انکی خوشی کی انتہا نہ رہی ان تمام کی محبت میں ابال آیا اور میرے بھیجے گئے پتہ پر شروع ہوا خطوں کا سلسلہ۔ ہمدردی، دلاسہ، ہمت افزائی، میرے حق میں دُعاؤں کا جیسے سیلاب پھوٹ پڑا۔ اُن مراسالات نے میرے شہر کی حقیقی تصویر خصوصاً تعلیمی اور ثقافتی حالات سے واقفیت کروا دی۔

تقریباً تمام کے خطوط میں ایک شخص کا ذکر عام اور بالخصوص واضح تھا وہ تھے عالی جناب" باباحضیت (حضرت) زاہد تعظیم ابوزرغازی" 'غازی' یہ اعزاز قوم کی سماجی، فلاحی اور تعلیمی خدمات کے لئے مقامی و ریاستی اصلاحی تنظیموں نے اُنہیں عطا کیا تھا۔

میری پھوپھی زاد بہن 'سکینہ ثریّا انصاری' کے ذہن میں میرے رشتہ کو لیکر فطور پنپ گیا۔ سکینہ نے مجھے ایک بڑی کار کمپنی کا افسرِ اعلیٰ CEO قرار دیا اور میری تنخواہ لاکھوں میں کردی۔ ان کی نشر واشاعت، فصاحت و بلاغت کا بے معنی اشتہار تھا۔ آخر ایک دن سکینہ نے اپنی طور سے ایک میزائیل داغ ہی دیا اور سارے شہر میں اعلان کردیا ڈھنڈورا پٹوائی کہ میرا رشتہ ایک مقامی لڑکی سے طئے ہوا اور اسے پکّا بھی کرلیا گیا۔ اس بے ہودہ مذاق کی توقع ہی نہ تھی۔ میں اپنے طور سے خاموش رہا۔ لیکن سکینہ کے شاکرانہ عملی موڑ نے مجھے پھر انکی طرف متوجہ کرلیا۔ جس دوشیزہ سے میرا رشتہ طئے کیا تھا اسکا نام تھا" کشش شائستہ رانا" اسی کا لکھا ایک دلکش خوبصورت لفافہ مجھے دستیاب ہوا میں نے اس خط کو نظر انداز کیا۔ لیکن دل و دماغ میں ایک انجانی کیفیت نے مجھے مضطرب کیا آخر میں نے لفافہ کو کھول دیا۔ کشش رانا کی لکھی ہوئی چِٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔ کافی خوش خط، خوبصورت کتابت، سرسری نظر دوڑائی تو خط میں محفوظ

جاذبیت اور چاہت کے نفیس احساس نے مجھے اسکی طرف کھینچ لیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس تحریر کو تفصیل سے پڑھنا شروع کیا۔ " مدثر! میرے ہم نفس، میرے ہم نوا "

تسلیم

آپکی پھوپھی زاد بہن 'سکینہ ثریّا انصاری' سے آپ مجھ سے متعارف ہیں۔ انہیں کی حوصلہ افزائی و ہمت افزائی اور رہنمائی میں یہ میرا پہلا تحریری رابطہ ہے اس پہلی تحریری ملاقات نے میری دل کی کیفیت کو بڑا مضطرب کیا، کچھ لمحات تو ساکت و خاموش سوچتی رہی کہ کیا لکھوں؟ کیسے بیان کروں اپنے دل کی کیفیت، اپنے اندر اٹھے اس پیار کے طوفاں کو؟ ایک مشکل ترین مرحلہ، سخت ترین امتحانی گھڑی، ایک عجیب سی کشمکش، الجھن، دل کو کافی منانا پڑا، اور پھر یہ بھی ضروری تھا کہ خط صرف ایک لفاظی تحریر ہی نہ ہو۔ آپ کے مزاج آپکی عادتوں سے بالکل بے نیاز ، نہ صرف دلی وذہنی توازن کو برقرار رکھنا شرط تھا بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ کہیں پہلی ہی ملاقات میں میری بے تکلفی اور بے ہودگی کا سکہ ہی میرے ماتھے چسپاں نہ ہوجائے اور نہ ہی مجھ سے کوئی گستاخی ہوجائے۔ لیکن اظہارِ عشق میں کچھ گستاخی ضروری بھی ہوتی ہے، محبت میں کھٹاس مٹھاس کا چسکا نہ ہو تو وہ کیسی محبت ! تمہارے تصوّرات خیالات کی شدّت اسقدر کہ ہم دونوں کی ایک حقیقی ملاقات کا منظر میرے نظروں کے سامنے روشن تھا۔ "ہم دونوں زمانے کی بدنظروں سے دور ایک بہشتی ماحول میں، ایک شکارے پہ سوار جھیل کے خوبصورت اور دلکش منظر میں لطف اندوز ہیں ،

پھولوں سے لدی سیج پہ لیٹے بے تکلف، گستاخ اور شرارتوں میں اسقدر مدہوش، بے خبر کہ زمانے کا، اردگرد کے ماحول سے بدگمانی۔ میرا وجود تمہاری مضبوط باہوں کی پناہ میں جھوم رہا ہے، میری نظریں تمہاری آفتابی نظروں کی شعاعوں کو اپنی نظروں میں جذب کئے عشق و محبت کے جذبے کو توانائی بخش رہے ہیں، میرے رُخسار پہ تمہاری انگلیوں کی طلسمائی جنبش اور میرے ماتھے کو تمہارے لمس نے دل و دماغ پر عشق کے نقش بنا دئے۔ میں بے حد خوش تھی جیسے ساری کائینات میرے دامنِ عشق میں قید ہے۔"

یہ خیالی تسلسل ٹوٹا تو میں پسینے میں شرابور تھی۔ "میں بڑی بے حیا ہوئی جا رہی ہوں پہلی ہی ملاقات میں اسقدر بے تکلفی۔ توبہ !" انجانے میں جذبات کے بہاؤ میں اپنے وجود کو آپکی سپردگی کے بیباک تصور میں مجھ سے گستاخی ضرور ہوئی۔ میں 'معذرت' چاہتی ہوں۔

خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔ آپکے جواب کا انتظار رہیگا۔

آپکی کشش شائستہ رانا

کشش رانا کے پہلے ہی خط سے کچھ بدگمانی کا احساس ضرور ہوا لیکن اسکی بے تکلفی، جرأتمندی، تخّیل کی اڑان، مبالغہ آرائی، منظرکشی اور عشقیہ تراشی، نے مجھے کافی متاثر کیا۔ اسکے آزاد سوچ سے کچھ بدعت یا انقلابی بدگمانی کا احساس ضرور ہوا پر جدید دور میں پڑھے لکھے طبقے میں کچھ حد تک یہ جائز ہے۔ کشش کے خطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسکے ہر خط میں ایک نیا خیال، ایک نیا انداز ہوتا اور اسکے عشقیہ بیان میں پوشیدہ بے پناہ مثبت صلاحیتیں، خوبصورت خیالات نے میرے دل و دماغ پر گہرے نقش چھوڑ دئے اور میں کشش کی جانب راغب ہوتا چلا گیا اسکی محبت اسکے عشق میں قید ہوتا چلا گیا۔ اس عشقیہ ماحول نے میری زندگی کو خوشگواری اور مسرّت بھرے خوشی کے لمحات بخشے جس سے میں مطمئن تھا۔

لیکن میری قسمت کو یہ کہاں منظور! شام کا وقت اچانک جیٹ لڑاکو جہازوں، کی خوفناک گونج اور میزائلوں کے پھٹنے کی دلخراش آوازوں نے سارے موحول کو حشر کا میداں بنا دیا۔ دُشمن نے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لئے کیمیائی ہتھیار کا استعمال کر چاروں طرف تباہی مچا دی، شہر کی آباد، بستیوں کو تہس نہس، نست نابود کر کھنڈر بنا دئے۔ میرے سارے ساتھی عمارت کے ملبے میں دفن ہو گئے۔ میرے دونوں پیر عمارت کی کچھ سلاخوں میں دھنس گئے تھے شدیش ترین درد اور تکلیف برداشت سے باہر، مجھ پر بے ہوشی کا عالم اور جب ہوش سنبھالا تو اسپتال میں آنکھیں کھولیں۔ میں نے اپنے دونوں پیروں کی طرف نگاہیں ڈالیں تو صدمہ کی شدت اسقدر کہ میری ایک وحشیانہ گنج نے اسپتال کے سارے طبّی عملہ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ تمام فوراً میری طرف دوڑ پڑے۔ میں بے قابو سا ان پر ٹوٹ پڑا "میرے دونوں پیر؟ میرے دونوں پیر کہاں ہیں؟" اسپتال کے میڈکل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے مکمل اعتبار میں لئے صبر و تحمل کی درخواست کی اور کہا کہ" ہنگامی صورت حال میں لوہے کی سلاخوں میں دھنسے ان پیروں ایک طبی فوجی جراح Army Surgeon کی خدمات کو جائے مقام پر حاصل کر لی گئیں اور کافی کوششوں کے بعد تمہارے دونوں پیر تمہارے جسم سے قطع کر دیئے گئے اور اور کافی کوششوں کے بعد ڈاکٹروں نے تمہاری جان بچائی"

ہنگامی حالات کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ انجام کی پرواہ کئے بغیر کشش کو ساری حقیقت سے واقف کرانا ایک اخلاقی فرض اور ذمہ داری تھی۔ اسپتال کے ناظم نے کشش سے فون پہ میرا رابطہ کروایا۔ حادثہ کی حقیقت نے کشش کو کافی صدمہ پہنچایا وہ مایوس اور اداس اس قدر کہ صرف اسکی رونے کی سسکیاں ہی میں سُن پایا۔ میں نے کشش کو دلاسا دیا اور اپنے ملک اور شہر کی واپسی کا وعدہ کیا اور فون بند کر دیا۔

میں عراق سے کافی مایوس اپنے وطن لوٹ رہا تھا، اپاہج معذور زندگی کا غیر یقینی تاریک مستقبل ہزاروں مسائل درپیش! اسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ ہوائی جہاز کے زمین پر اترنے Landing کا اعلان ہوا۔ ایرپورٹ کے Exit door سے باہر نکل آیا۔ سامنے دیکھا ایک بزرگ" مدثر صدقی خوش آمدید" اردو میں لکھی تختی لئے میرے منتظر تھے۔ یہ بالکل غیر متوقعہ و حیران کن تھا۔ میں نے بزرگ کو غور سے دیکھا فرشتہ صفت سفید پوش بزرگ اپنے آفتابی روشن نورانی تابناک چہرہ اور ہونٹوں پر ایک مسّرتی مسکراہٹ لئے میری جانب تیزی سے بڑھے اور اپنے دونوں زانوں پہ بیٹھے کافی گرم جوشی مجھ سے لپٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے کچھ آنسوں کے قطرے میرے چہرے پر ٹپکنے لگے۔ برسوں سے تشنا میرا دامن شفقت، محبت سے سیراب ہوا۔ میں بڑی مضبوطی سے انکی آغوش سے چمٹا رہا۔ مجھے روحانی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

کچھ وقفہ بعد ہم دونوں اپنے شہر پہنچنے کے لئے ناممپلی [حیدرآباد] اسٹیشن پہنچ گئے۔ اب ہم دونوں اپنی منزل کی جانب نکل پڑے۔ میری تفتیش سے پہلے ہی حضت نے کہا میں" زاہد ابوزر" آپ کے والد میرے کافی عزیز اور قریب تر حبیب رہے ہیں۔ میرے بُرے خستہ اور غریبی حالات میں انہوں نے اپنی معاشی سخاوت اور ہمدردی کی ایک مثال قائم کی۔ جب میرے معاشی حالات کافی اچھے ہوئے اور میں نے چاہا کہ ان کا قرض اور احسانات کا سارا بوجھ اتار دوں تو اچانک پولس ایکشن ہوا اور میرے محِسن، میرے فیاض، پر قیامت ٹوٹ پڑی، گردشِ دوراں نے، حیوانی وہشت کے خونخوار پنجوں انہیں دبوچ لیا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ تم اکیلے ہی زندہ بچ گئے ہو تو میں تمہاری تلاش میں قریبی ہر شہر، قصبہ کی خاک چھانی، دن رات ایک کر دئے پر تمہارا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بس ماتم میں ڈوبے بُرے حالات، بُرے وقت کے رستے آبلوں کو اپنی پناہ میں لئے خدا سے تمہاری حیات، عُمر درازی اور خیریت کی دُعا میں

مصروف رہا۔ کچھ برسوں بعد جب اطلاع ملی کہ تم عراق میں کسی کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہو تب اطمینان ہوا اور بس انتظار رہا تمہاری واپسی کا"

میں بغور سنتا رہا اور سفر کی تھکان کی وجہ مجھے نیند لگ گئی۔ ٹرین اسٹیشن پر پہنچتے ہی بابا حضت نے مجھے جگایا اور ہم دونوں ریلوے اسٹیشن سے باہر کی طرف نکل پڑے۔ اسٹیشن کے صدر دروازے پر پہنچے تو ایک خوبصورت لڑکی پر میری نظریں پڑیں، وہ بڑی بے چینی سے کسی کی منتظر تھی جب اس نے مجھے دیکھا تو کافی خوش ہوئی پر جیسے ہی بابا حضت پہ اسکی نظر پڑیں تو وہ سہم گئی، اور اپنی نظریں جھکائی وہاں سے نکل گئی۔

گھنی جھاڑیوں میں آباد چھوٹے چھوٹے پُختے مکانات اور ان کے بیچوں بیچ ایک حویلی نما کشادہ کمروں والے رہائشی ہال میں ہم دونوں داخل ہوئے۔

طویل سفر کی تھکان سے راحت پانے کچھ آرام کرنا چاہا۔ دل و دماغ میں کشش رانا' کی یادیں اور اس کی چاہت کا طوفان نے مجھے اسقدر بے چین بے

قرار کر رکھا کہ کسی پل چین تھا نہ سکون۔ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔صبح اُٹھا fresh ہوا بابا سے اجازت لی۔ باباحضت نے میرے لئے ایک سواری کا انتظام کرر کھا تھا۔ اب میں نکل پڑا کشش کی جانب۔فوراً ذہن میں خیال آیا اس ٹیلی فون بوتھ کا جہاں سے ہم دونوں میں رابطہ برقرار رہتا۔وہاں پہنچ گیا۔

بوتھ مالک نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا'' آپ مدثر صدیقی صاحب؟' 'میں چونک گیا پھر فوراً جواب'' ہاں میں ہی مدثر صدیقی ہوں۔آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟'' سامنے عمارت کی طرف اشارہ کرتا ہوابتایا ''یہ اس شہر کامشہورترین مولانا ابولکلام آزاد کیمپس ہے۔ جسے'' باباحضت (حضرت) زاہد تعظیم ابوزرغازی '' نے اپنی جان توڑ کوششوں کے بعد اسکی بنیاد رکھی ہے۔اس کے مرکز میں ایک عالی شان فنکشن ہال میں تمہاری ایک بڑی سی تصویر لٹکی ہوئی ہے۔ ہر سال کی ستمبر میں سالانہ پولس اکشن کے مرحومین کے لئے تعزیتی جلسہ منعقد ہوتا ہے جسمیں سارا شہر شامل ہوتا ہے''۔میں کافی متاثر ہوا۔جلد ہی اپنے اصل مقصد پہ آ گیا اور کشش کی تفتیش سے پہلے ہی بوتھ مالک مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے ''صاحب وہ 'کشش شائستہ رانا' ہیں۔سارے شہر میں وہ 'کشش' اسی نام سے جانی جاتی ہیں۔اسی کیمپس میں کالیج میں لیکچرر ہیں''۔ میں ان سے التجا کی کہا'' آپ ہی فون پہ انہیں میری آمد کی اطلاع دیں براہِ راست میرا ان سے گفتگو کرنا زیبا نہیں دیتا'' انہوں نے رابطہ کرلیا دریافت کرلیا اور مجھے اطلاع دی کہ کشش کالیج کی چھٹی کی فوراً بعد شہر کے مرکزی سِٹی گارڈن میں میرا انتظار کریں گی۔ میں سِٹی گارڈن کی طرف روانہ ہوا۔میری ملاقات کا مقصد محض کشش کے دل کی کیفیت جاننا تھا۔میری معذوری کی خبر نے کشش میں سُلگی عشق کی چنگاری کہیں بجھ تو نہیں گئی؟ یہی سوچتا میں سِٹی گارڈن پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد کشش وہاں پہنچیں اپنے چہرے سے حجاب ہٹا لیا۔اسکی پلکوں پہ چھلکتے آنسوں کے قطروں نے مجھے بے تاب کر دیا اور احساس ہوا کہ کشش کے دل میں میری محبت آباد ہے۔اس کی چاہت نے مجھے بے قابو کر دیا چاہا کہ ان ٹپکتے ان آنسوؤں اپنے وجود میں سما لوں لیکن میری معذوری نے مجھے وہیں روکے رکھا۔میں وہیں سہا بیٹھا رہا۔کشش مجھ سے کچھ فاصلہ پہ بیٹھ گئی۔میں نے اپنی پہلی محبت کو اپنے روبرو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہا، ماہتابی روشن چہرہ، خوبصورتی کی بے مثال مورت، احساسِ کمتری نے مجھے شرمندہ ضرور کیا پر پست ہمت بالکل نہیں۔

''کہاں کھو گئے؟ ''کشش کی میٹھی آواز سے بیدار ہوا

کہا'' کھو گیا تھا حسین وادیوں میں''

'' اب یہ بتائے کہ تم نے مجھے یہاں بُلایا کیوں؟'' کشش نے پوچھا

''عراق کا میلوں کا فاصلہ طئے کیا محض میری پہلی چاہت، میری پہل محبت سے اسکی پہلی ملاقات کے لئے میں بے چین تھا'' میں نے جواب دیا۔

''غلط فہمی میں ہو'' کشش

''غلط فہمی ضرور ہوتی گر تم ریلوے اسٹیشن میری تلاش میں نہ آتیں! کشش دل کی بات دل ہی بہتر جانتا ہے'' میں نے جواب دیا

''حقیقت سے ناواقف ہو'' کشش

''حقیقت سے خوب واقفیت ہے اسی لئے تمہارے دیدار کے لئے تڑپتا رہا، انتظار کرتا رہا!

''اس ملاقات سے وہ انتظار بہتر تھا؟''

''نہیں اب اور انتظار نہیں۔فراق میں کب تک تمہاری محبت، چاہت اور عشق کے جذبات سے سرابور تمہارے اُن خطوط کو سینے سے چپکائے اپنی محبت کے لئے ترستا رہوں گا''

''ان خطوط کی حقیقت جانتے ہو؟ ''

''کیا ہے؟''

'' وہ سارے خطوط مجھ سے لکھوائے گئے''

کشش کی یہ بات ایک نیزے کی مانند میرے دل کو چیرتی ہوئی زخمی کرگئی۔صدمے سے ٹوٹا مایوس لہجے میں پوچھا

''لکھوائے گئے؟ کس کے لئے اور کس نے ؟''

کشش نے فوراً جوب دیا ''تمہاری پھوپھی زاد بہن 'سکینہ ثُریا' نے 'رضیہ ' کے لئے''

''کون رضیہ؟''

''تمہاری خاطر سکینہ کی منتخب شہزادی جس سے تمہارا رشتہ بھی پکا کرلیا گیا تھا''

لیکن تمہارے دستیاب سارے خطوط میں سِوائے تمہارے نام کے رضیہ کا نام تو میں نے خطوط کے کسی حاشیہ میں بھی نہیں پڑھا !

''سکینہ کی سخت تاکید تھی کہ رضیہ کی بے نقابی تو درکنار اسکے نام کا اظہار بھی کسی خط میں نہ ہو!

''وجہ ؟''

''سکینہ ہی بہتر جانے۔۔۔۔''

''رضیہ کے لئے تم لکھتی تھیں؟''

''رضیہ میری عزیز سہیلی تھی اور جب وہ تمہیں خط لکھنے بیٹھ جاتی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا اور اس پہ نیم بیہوشی طاری ہو جاتی اور پھر سکینہ کا اصرار ہوتا کہ سارا مضمون میں ہی لکھ دوں''

دونوں خاموش، ساکت، صدمے اور شدتی ضرب نے دونوں کو جیسے مفلوج کر دیا۔

''اگر تم رضیہ کے لئے خط لکھتی ان میں جو جذبات ہوتے، محبت کا احساس تو تمہارا ہی ہوتا نا؟ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے''

کشش نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموش بیٹھی رہیں

''کشش تمہاری خاموشی سے ظاہر ہے کہ میری معذوری اور اِپاہجی کی خبر نے تمہارے دل کی کیفیت بدل ڈالی، سُلگی اس عشق کی چنگاری کو بجھا ڈالا؟''

'' خدارا بس ! اب بس بھی کردو مدثر ، واسطہ رب العالمین کا ،اسقدر ذلیل رسوانہ کرو، یہ تہمت کہیں میری جان پہ نہ آ جائے''

''تمہاری ان باتوں نے تو میری جان ہی لے لی۔ مجھے بے حِس کر دیا نا! کشش یہ تمہارے عشق، محبت کی چاہت تھی جس نے مجھے موت کے منہ سے باہر نکالا اور اب تو تمہارئے در پہ ایک اپاہج اور معذور کھڑا

ہوں کیا تمہیں اب بھی یقین ہے کہ میں زندگی کا سکھ چین، ساری خوشیاں مسرّتیں دے پاؤں گا؟''

''امید سے زیادہ دوگے'' کشش نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کشش کے اس جواب نے مجھے لاجواب کردیا۔ میں کشش کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا میرے عشق میں پوری طرح مدہوش تھیں اب دونوں کی نظروں میں عشق کی آفتابی کرنیں نئی امید کو جگایا۔ اب میں کافی مطمئن تھا۔ کشش رانا اب جیسے اب میری اپنی تھی۔ اب ہماری گفتگو کچھ بےتکلفانہ شروع رہی لیکن ایک محدود تہذیبی دائرے میں دونوں میں باقائدہ ایک مستقیل فاصلہ قائم رہا۔

'' رضیہ کا کیا ہوا''۔ میں نے پوچھا

''جیسے ہی رضیہ کو تمہارے معذور وا پاہج ہونے کا پتہ چلا تو وہ اسقدر بے رُخ و بے حس ہوئی کہ جیسے وہ تمہیں جانتی ہی نہ تھی مجھ سے بھی منہہ موڑ لیا۔

تمہاری وہ پھوپھی زاد بہن کا مزاج انکا برتاؤ بھی کافی غیرانہ ہوگیا۔ برادری اور خون کے آپسی رشتوں اور آپسی محبت پر بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا۔ کسی کی جذبات سے کھیلنے کسی کو حق نہیں معاف کرنا میں نے کچھ غلط نہیں نا کہا''

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ خیر بھول جاؤ ان باتوں کو، میری اپاہجی اور معذوری نے ان تمام رشتوں کو مفلوج کردیا۔ لیکن کشش تمہارا عشق میرے دل و دماغ میں گہرا گیا ہے۔ کیا میرا حق نہیں کہ میں اپنے ''ہم نفس میرے ہم نوا'' میری کشش کی اپنی زندگی کے بارے میں بھی کچھ جان جاؤں؟

کشش اب کافی سنجیدہ تھی اس نے اپنی ساری تفصیل لفظ بہ لفظ بتانا شروع کیا۔

''میں بھی اس پولس ایکشن کی مظلوم رہی ہوں اور میری ہی طرح کئی مظلوم لڑکیاں یتیم خانے کی چاردیواریوں میں قید ہوگئیں۔ باباحضت نے اس ناگہانی ہنگامی ضرورت کی نزاکت کو جانتے ہوئے عیدگاہ اور وقف کی زمین پر عارضی خیمے کھڑے کئے اور تمام بے سہارا جس میں کثیر تعداد تھی معصوم، جوان، بوڑھی عورتوں، ان گنے بیواؤں کی کا مسیحؐ بنے ان تمام کو ان خیموں میں پناہ دی۔ مقامی فرقہ پرست طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلے کرتے رہے، پریشانیوں مصائب، تکالیف کو اپنے سینے پہ جھیلا، اپنی تحریک پہ بضدر رہے، سارے ملک میں اپنی جھولی پسارے مدد کے لئے بھیک مانگتے رہے۔ ان کوششوں کا ثمرہ یہ رہا کہ عوام ان کی نیک نیتی اور سماجی حقیقی اصلاح سے باخبر ہوئی۔ نتیجہ یہ رہا کہ نہ صرف ملک سے بلکہ غیرملکوں سے فنڈس اور امداد کا ایک سیلاب اُمڈ گیا۔ سب سے پہلے باباحضت نے'' مولانا ابولکلام آزاد کیمپس'' اس تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی، یہاں ہر شعبہ کی تعلیم مہیا کروائی۔ اور فخر کی بات یہ ہے کہ ساری ریاست میں اسکا تعلیمی معیار اعلیٰ ترین، درجہ اول رہا۔ خصوصاً ہم لڑکیوں کی تعلیم، تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ تمام مظلومین کے لئے رہائیشی انتظام کیا انہیں آباد کیا۔ 'مدثر' باباحضت کی زبان پر ہمیشہ تمہارا ذکر، تمہاری محنت، جدوجہد، کامیابی کی مثالیں دی جاتیں۔ بالخصوص فنکشن ہال میں تمہاری ایک بڑی سی تصویر لگا رکھی ہے۔ اسی تصویر نے مجھے تمہاری طرف راغب کیا، تبھی سے تم میرے دل و دماغ میں بس گئے۔''

میں سوچ میں ڈوبا رہا۔ کشش نے کہا

''چلئے اب واپس چلتے ہیں''

ہم دونوں نے وہاں سے رُخصت ہوئے۔

شام کا وقت میں اور باباحضت دونوں دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ باباحضت مجھے بڑی غور و فکر سے دیکھا اور کہا۔

''بیٹے مدثر آج میں بے حد خوش ہوں میری روح کو تسکین عطا ہوئی۔ میں تمہارے خاندان کا مقروض تھا خدا نے میری سن لی۔ میں نے تمہارے لئے ورک شاپ تیار رکھا ہے اور چاہتا ہوں تم ایک کامیاب زندگی کا آغاز کردو۔

''میں کافی سنجیدہ ہوں، اپنی ساری ذمہ دوریوں کو بخوبی سنبھالوں گا''۔ میں نے جواب دیا۔

ہم یوں ہی اپنی باتوں میں گم تھے اچانک ہمارے روبرو کشش باباحضت کو آداب کیا بہ حجاب اپنا سر جُھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''مدثر صِدیقی اور کشش رانا کل سیٹی گارڈن میں تم دونوں محوِ گفتگو دیکھے گئے۔ ہم نے اسکی تصدیق کرلی ہے۔ ''مدثر بتاؤ ماجرا کیا ہے؟''

یہ سُن کر میرے پیروں تلے کی زمیں کھسک گئی، پسینے میں شرابور، گھبرایا سا پس و پیش میں ''ہاں' ''ہاں'' ''نانا' ''نانا' کرتا رہا

کشش نے بیبا کی و دلیری جواب دیا۔

''محترم باباحضت قدم بوسی، میں خدا کو حاضر ناضر جانتے ہوئے اس بات کی تصدیق کرتی ہوں کہ ہم دونوں میں اور مدثر صِدیقی اس باغ میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

اب میں خاموش کیسے رہتا میں نے جواب دیا ''ہاں ہاں بابا میں بھی تصدیق کرتا ہوں''

''بیٹیا کشش شائستہ رانا' میں جانتا ہوں آپ کافی بہادر دلیر اور سمجھدار ہو۔ مدثر صِدیقی کے لئے تمہارے دل میں جو کیفیت ہے سراہنی ہے، قابلِ تعریف ہے لیکن ظاہری حقیقت کو نظر انداز کرنا گناہ بھی ہے۔ بیٹی تم نے مدثر سے ملاقات بھی کی ہے اسے روبرو دیکھا بھی ہے۔ کیا اب بھی تم تسلیم کرتی ہو مدثر تمہیں ازدوجی زندگی میں خوش رکھ پائے گا؟ بے جھجک بے تکلف بتادو۔ کیونکہ مدثر معذور ہے!!

''باباحضت گستاخی معاف! محترم عزّت مآب، آپکی کی مبارک سے زباں سے 'معذور' اس لفظ نے مجھے گہری چوٹ پہنچائی! حضت میری قسمت کی جھولی میں مدثر یہی میرے لئے اللہ کی رحمت! میرے اب العالمین نے مجھے بخشا مدثر یہی میرا مقدّر رہے اور فخر ہے مجھے اپنی قسمت پر، ساری عمر میں مدثر صدیقی کی بیساکھیاں بن کر، قرباں کردونگی اس فانی زندگی کو!''

باباحضت بے حد متاثر، فخر اور لامحدو خوشی نے ان کی آنکھوں کے گوشوں کو نم کردیا، وہ انمول آنسو کے قطرے زمیں پر گرنے سے پہلے میں نے کشش کا سہارا لیا ہم دونوں ان کی طرف بڑھے ان آنسوؤں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں پہ تھاما اور اپنے ماتھے اور اپنی پلکوں پہ انہیں سجادیا۔

باباحضت نے ہمیں اپنی دُعاؤں سے نوازہ اب میں اور کشش دونوں زندگی کی نئی راہوں پر نکل پڑے ہیں۔۔۔۔۔۔! ●●

راشدالخیری بحیثیت مضمون نگار

ڈاکٹر محمد اکبر

اس عہد کی ایک اہم صنف مضمون نگاری ہے۔اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا 1845 کے آس پاس ہوچکی تھی۔مگر اس کی مقبولیت کا زمانہ 1857 کے بعد شروع ہوتا ہے اور یہ صنف ہمارے یہاں مغربی اثرات کے تحت داخل ہوئی۔

مضمون اردو نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے کافی وسعت اور تنوع ہے یہ صنف انگریزی کے Essay کے مترادف ہے۔اس صنف کو رائج کرنے میں سرسید احمد خان کا رسالہ تہذیب الاخلاق کافی اہم ہے۔

اردو میں سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور شرر کے مضامین بلاشبہہ اپنی جگہ اہم ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید سے پہلے اردو کا کوئی ادیب اپنے ذہن میں اس صنف کا واضح اور مستقل تصور نہیں رکھتا تھا۔سرسید نے پہلی بار شعوری طور پر اسے مستقل صنف کے طور پر برتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے اردو میں اخبار رسائل موجود تھے جس میں ادبی و علمی مضامین شائع ہورہے تھے۔مگر صحیح معنوں میں تہذیب الاخلاق ہی اردو کا پہلا رسالہ تھا جس نے اردو کے دور جدید میں اس نئی صنف کو مقبول بنایا۔اردو میں سادہ نویسی کی تحریک کا آغاز کیا۔موضوعات کی تنگ دامنی کو محسوس کرتے ہوئے مختلف موضوعات پر مختصر مضامین ومقالات لکھ کر اردو والوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

راشدالخیری نے اپنا تخلیقی سفر اس وقت شروع کیا جب ہندوستان میں جدید تعلیم اپنی ابتدائی حالت میں تھی اور اخبار و رسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بہت کم تھے۔جن خاندانوں میں تعلیم کا تھوڑا بہت چرچا تھا ان میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو اخبار اور رسائل کو لڑکیوں کی نظر سے گزرنا معیوب سمجھتے تھے۔ان حالات میں لڑکیوں کی تعلیم، اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں پر مضامین لکھنا بہت ہمت کا کام تھا۔یہ وہی شخص کرسکتا تھا جن کے دلوں میں تھوڑا بہت عورتوں کی ترقی اور اصلاح کا حقیقی درد موجود ہو۔

راشدالخیری تعلیم نسواں کے حامی تھے اور مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً نسوانی زندگی کے فلسفے، بے بسی اور بے کسی پر مضامین لکھتے رہے۔ان کے ابتدائی مضامین سرسید اور حالی کے افکار ونظریات کا واضح اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔مثلاً ''دنیا کی بڑی جنت''بہار شب کا خاتمہ''ابدی زندگی''''فلسفہ موت''''عالم خیال''اور چراغ سحری میں۔

بعض انگریزی مضمون نگاروں کا بھی ان کی تحریروں پر اثر تھا انھوں نے انگریزی مضامین کے ترجمے بھی کیے ہیں رسالہ عصمت میں ''چمنستان مغرب'' نامی مستقل عنوان کے تحت لارڈلٹن کی ''لیلیٰ'' کا ترجمہ شائع ہوا۔اس سلسلے میں انھوں نے تہذیب نسواں کے ایڈیٹر سید امتیاز علی تاج کو ایک خط میں لکھا تھا:

''کچھ شک نہیں لارڈلٹن کی لیلیٰ یہ حق رکھتی ہے کہ مسلمان اس کا ترجمہ اردو میں کریں اور وہ یقیناً اس پایہ کی کتاب ہے کہ اردو لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ کرے گی۔''

(سوانح عمری علامہ راشدالخیری، عصمت جولائی اگست 1964 ص 546,547)

راشدالخیری کے تراجم کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہیں۔ انھوں نے مغربی مصنفین کے ان مختصر مضامین کے کبھی کبھار ترجمے کیے ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے عمدہ ہیں اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے معیاری ہیں لیکن وہ لفظی ترجمے کے قائل نہیں تھے ان کی رائے میں ترجمے کی بڑی خوبی دوسری زبانوں کے مضمون کا مفہوم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنا ہے کہ وہ ترجمہ نہ محسوس ہو۔یہ وصف راشدالخیری کے ترجموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ملاحظہ ہو فلسفہ موت کا ایک اقتباس:

''انسان زندگی میں ہسنے کا حق رکھتا ہے مگر موت پر رونے کا اس کو کوئی حق نہیں۔اس کے کان میں پہلی لوری موت کے فرشتے ہی نے دی تھی۔وہ شجر موت کے سایہ میں پیدا ہوا اور موت کے ہاتھوں میں اس کی پرورش ہوئی۔جب وہ زندگی کی دلچسپیوں میں شریک ہوکر مسرت کے فرشتے سے ہمکنار ہوا تھا تو اس کی خوشیوں کے اضافے میں ایک ہاتھ خصوصیت سے کام کررہا تھا اور وہ موت کا تھا جو اپنا شکار تیار کررہی تھی۔اس کو سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ خوشی جو زندگی نے مجھے عطا کی ہے اس کی دوسری بہن موت کا عطیہ ہے جس کی زندگی کا انحصار میرے ہی جیسے جسموں کی خوراک پر ہے۔''

(ساقی، دہلی راشدالخیری نمبر ستمبر 1936 ص 61)

راشدالخیری کی مضمون نگاری پر بحث کرنے سے قبل ان کے مضامین کے متفرق مجموعے کے بارے میں جان لینا ضروری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

عروس مشرق

مغرب کی اندھی تقلید کو روکنے اور مشرقی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف مضامین کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈپو دہلی طبع اول 1936 یہ 76 صفحات پر مستمل کتاب کل پانچ بار طبع ہوئی۔

نالہ زار

لڑکیوں اور عورتوں کی حمایت میں مضامین کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈپو دہلی طبع اول 1936 یہ مضامین عصمت دہلی وتمدن دہلی میں 1908 تا 1918 شائع

اسسٹنٹ پروفیسر سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہوئے کتاب کے کل صفحات 88 یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا۔

گدڑی میں لعل

سلیقہ شعار ہنر مند اور خانہ داری سے متعلق مضامین کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1936 یہ مضامین 1909 تا 1924 رسالہ ''عصمت'' دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ 1964 تک پانچ بار طبع ہوا۔

مسلمان عورت کے حقوق

حقوق نسواں کے سلسلے میں ترکہ پدری، خلع، کثرت ازدواج، مہر، بیوہ کا نکاح، شادی کی رضامندی، پردہ کی سختی، لڑکیوں کی تعلیم، بیوی کا درجہ، عورت کی شخصیت و حریت نسواں، سے متعلق مختلف مضامین کا مجموعہ۔ مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی طبع اول 1938 کل صفحات 104، یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

دلی کی آخری بہار

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 پچیس مضامین جن میں دلی کا مرثیہ لکھا گیا ہے۔ کل صفحات 127 کتاب پانچ بار طبع ہو چکی ہے۔

یادگار تمدن

حقوق نسواں کی حمایت میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ جو راشد الخیری نے رسالہ تمدن میں لکھا تھا۔ مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی طبع اول 1937، 48 صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا۔

چمنستان مغرب (تراجم)

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 یہ تراجم اول اول رسالہ ''سہیلی'' دہلی 1923 میں طبع ہوئے۔ کتاب کی ضخامت ایک سو صفحات سے زاید۔ اس کتاب میں لارڈلٹن کی ''لیلیٰ'' کا ترجمہ بھی شامل ہے یہ تراجم علامہ نے مختلف قلمی ناموں سے شائع کیے تھے یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

بے فکری کا آخری دن

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1936 اس میں شامل مضامین کنواری لڑکیوں کی لیے 1912 تا 1922 عصمت اور سہیلی میں شائع کیے گئے یہ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔

بلبل بیمار

لڑکیوں کی تعلیم اور پردے پر 19 مضامین کا مجموعہ یہ مضامین عصمت دہلی اور خطیب دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

داستان پارینہ

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 غیر مسلم متعصب مورخین کے اعتراف کا 18 تاریخی مضامین کا جواب یہ مضامین عصمت دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ کل صفحات 88 یہ مجموعہ چار مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

قلب حزیں (مضامین اور افسانے)

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1928 یہ 30 مضامین اور افسانے راشد الخیری نے س، ش، ر کے قلمی ناموں سے لکھے تھے جو 1927 تک کے عصمت دہلی میں شائع ہوئے تھے۔

عالم نسواں

حریت نسواں کی کوشش پر تبصرہ اور مختلف زنانہ کانفرنسوں کی تجاویز پر بحث کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1938 کل 64 صفحات کا یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔

شادی کا انتخاب

لڑکے اور لڑکیوں کی شادی سے متعلق مسائل پر مضامین، مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1938 کل صفحات 56 یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔

بکھری ہوئی پتیاں (نظمیں اور مضامین)

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی طبع اول 1938۔ یہ مضامین اور نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے راشد الخیری کی بکھری ہوئی تحریریں کہنا چاہیے۔ کچھ مضامین اور نظمیں غیر مطبوعہ ہیں۔

فریب ہستی

شادی بیاہ اور موت کے موقع پر فضول اور قبیح رسوم کے خلاف اصلاحی مضامین کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1938 کل صفحات 84 یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

ساجن موہنی

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1938 شوہر کیوں کر بگڑتے ہیں، بے وقوف بیوی وغیرہ 13 مضامین کا مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

وداع خاتون (3 مضامین)

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی طبع اول 1929 راشد الخیری نے یہ تین مضامین اپنی جواں مرگ بہو خاتون اکرم سے متعلق 1924 اور 1925 میں ''مہمان دلہن''، تعزیت نامہ اور آپ بیتی کے عنوان سے لکھے تھے کل صفحات 24 یہ کتاب 6 بار طبع ہوئی۔

مذہبی مضامین کے مجموعے رانی قصے

رسالہ بنات 1927 میں شائع کردہ مذہبی مضامین نبیوں کے قصے اور مختصر حالات زندگی کا مجموعہ۔ مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1936 کل 144 صفحات کی کتاب 1964 تک چار بار شائع ہوئی۔

احکام نسواں

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 یہ کتاب تین بار طبع ہوئی اس میں شامل مضامین رسالہ بنات دہلی میں شائع ہو چکے تھے۔

محسن حقیقی

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 حضور اکرمؐ کی ذات گرامی سے متعلق 14 مضامین جو پہلی بار ''نظام المشائخ'' دہلی میں طبع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔

زیور اسلام

لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لیے عصمت کے ابتدائی سالوں میں مذہبی احکام سے متعلق لڑکیوں کے فرضی ناموں سے لکھے گئے مذہبی مضامین کا مجموعہ، مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1938 کل صفحات 108 یہ مجموعہ چار بار طبع ہو چکا ہے۔

دعائیں (نظم ونثر)

مطبوعہ عصمت بکڈ پو دہلی، طبع اول 1937 کل صفحات 64 تین بار طبع ہو چکی ہے۔

راشد الخیری کی سیرت وشخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان کے خاندانی ماحول اور ان مذہبی روایتوں کا زبردست حصہ رہا۔ جن میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ ان کا خاندان جید عالموں کا خاندان تھا۔ ان کے خانوادے میں عورتیں بھی قاریہ اور حافظہ تھیں۔ ان کے دادا مولانا عبدالقادر اپنے وقت کے جید عالم تھے انھیں شاہان مغلیہ کے استاذ ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان کے گھر میں مذہبی امور کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اسی ماحول میں راشد الخیری کی تربیت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں مذہبی عناصر کا زبردست اثر کارفرما رہا ہے۔ ان کے ذہن وفکر کی تعمیر میں ان کی ماں کا بھی بڑا رول رہا ہے۔ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن بچپن میں اخلاقی اور سبق آموز کہانیاں اور نبیوں کے قصے وغیرہ انھیں سنایا کرتی تھیں اسی کا ان کے ذہن پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ والد کی محرومی اور ماں کی بیوگی کے کرب نے انھیں ہمیشہ دکھی رکھا۔ ان تمام عوامل نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔

راشد الخیری جب سن شعور کو پہنچے تو مسلمانوں کا اقتدار رخصت ہو چکا تھا اور مسلمان تیزی سے زوال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور نفسیاتی طور پر شکست خوردگی کے احساس سے دوچار تھے۔ اس دور میں عورتوں کی اکثریت نہ صرف جاہل تھی بلکہ فرسودہ خیالات وعقائد اور غلط رسم ورواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مردوں کی ایک جماعت تو جدید تعلیم سے لیس ہو چکی تھی لیکن لڑکیوں کے لیے کوئی تعلیم کا انتظام نہیں تھا نہ کوئی ادارے قائم تھے۔ اور نہ ہی کوئی نصاب دستیاب تھا۔ جس کی وجہ سے مرد اور عورتوں میں شدید ناہمواری پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت لڑکیوں کی شادی کافی کم عمری ہی میں کردی جاتی تھی۔

اس عہد کے سماج میں اخلاقی گراوٹ اور پستی بڑے عروج پر تھی۔ مسلمانوں میں دنیا بھر کی برائیاں اور عیوب موجود تھے۔ ان میں بے عملی، بے حسی، جہالت، ظاہرداری، چاپلوسی، مکاری، عیش پرستی اور مذہب سے بے اعتقادی بڑھنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر لوگ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور شرفا کی طرز گفتگو سے بھی ناواقف تھے۔ سرسید نے ان تمام مسائل کا بغور جائزہ لیا اور پھر مسلمانوں میں عمل کی روح پھونکنے کا کارنامہ انجام دیا۔

چنانچہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے سرسید کے رفقا میں کچھ لوگوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ایسے لوگوں میں مولوی نذیر احمد کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ناول کو اپنا آلہ کار بنایا اور اصلاح کا درس دینا شروع کیا۔ راشد الخیری ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان ہی کے نہیں بلکہ ان کی حیثیت ان کے اثرات قبول کرنے والوں کی رہی ہے۔ راشد الخیری انھیں کے اثرات کے تحت عورتوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ناولوں میں ہی نہیں بلکہ مضامین میں بھی ایسے موضوعات کو برتنے کی کوشش کی جو اس زمانے میں عورتوں کے حالات اور اصلاح پر مبنی تھے۔ ادب کو تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے اور ان کے حقوق کی پاسداری کا احساس پیدا کرنے کے لیے وہ مسلسل تحریر وتقریر کے ذریعہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ انھوں نے اپنے تمام مضامین میں تربیت نسواں وحقوق نسواں کو ٹول کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی تخلیقات کا زیادہ تر حصہ اصلاح تربیت نسواں وحقوق نسواں ہے۔ راشد الخیری اپنے مضامین میں جہاں مردوں کو عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ عورتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی تلقین کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے معاشرے میں مذہبی قدروں کی پاسداری کی جائے اور مشرقی طرز زندگی کو اپناتے ہوئے خواتین اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کے تعلق سے وہ کوتاہی نہ برتیں۔ مولانا عورت کو مختلف حیثیتوں میں فرض شناس اور ایک ذمہ دار عورت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نئی تہذیب اور جدید معاشرت کے محاسن کو بیان کرنے میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ وہ تو ترقی اور روشن خیالی کے ہمیشہ سے حامی اور ساعی رہے۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ ہماری عورتیں یوروپ کی خوبیوں سے ضرور فائدہ اٹھائیں لیکن اپنی انفرادیت اور مشرقیت کو نہ کھوئیں۔ الغرض عورت کی اصلاح اور بہتری کے لیے انھوں نے جتنی جدوجہد کی اس کا احاطہ آسانی سے ممکن نہیں بقول مولانا نیاز فتح پوری:

''علامہ کی خدمت اصلاح نسواں کے باب میں اتنی متنوع، اس قدر ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہیں کہ ان پر نقد وتبصرہ تو خیر بڑی چیز ہے۔ معمولی اعتراف کے لیے بھی مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔''

(آج کل یکم فروری، 1944 ص 11)

اسی طرح حمایت نسواں کے سلسلے میں علی عباس حسینی رقمطراز ہیں:

''میرے نزدیک ملک کے کسی اہل قلم نے صنف نازک کی اصلاح کی اتنی سعی نہیں

کی جتنی مولانا مرحوم نے تاعمر جاری رکھی۔ آپ نے اپنی متعدد تصانیف میں اس پر اپنا غیر معمولی زورِ قلم صرف فرمایا اور نسوانی زندگی کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی ڈالی۔"

(عصمت راشدالخیری نمبر، جولائی اگست 1936 ص 231)

راشدالخیری کی نظر میں مسلمان عورت کی زندگی کا نصب العین خالص مشرقی اور اسلامی تھا۔ کیوں کہ اس نازک دور میں مفتوح قوم احساس کمتری میں مبتلا ہوکر فاتح اور حکمراں قوم کی تہذیب سے مرعوب ہوکر اپنی خوبیاں گنوا رہی تھی۔ ہندوستانی عورتیں مغرب کی تقلید میں اپنے سفر کا رخ بدل رہی تھیں۔ مولانا اس کا دامن پکڑ کر اس راہ سے ہٹانا چاہتے تھے جس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ان کے نزدیک اسلامی نظام زندگی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ وہ عورتوں میں حقیقی مذہبیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ زیور اسلام میں فرماتے ہیں:

"کوئی شخص مذہب سے الگ ہوکر مشکل سے ترقی کرسکتا ہے اور صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو برے کاموں سے روک سکتا ہے۔ مذہب کی یہ لاپرواہی بڑھتے بڑھتے اس کو (عورتوں کو) اس قابل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کو ادا کرنے میں غفلت سے کام لیتی ہیں۔ غرض کوئی لڑکی اس وقت تک اپنی زندگی اچھی طرح نہیں گزار سکتی جب تک کہ وہ مذہب کے احکام کی پابند نہ ہو۔"

(علامہ راشدالخیری، زیور اسلام، عصمت بکڈپو دہلی، طبع اول 1938ا ص 68)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راشدالخیری مذہب کو کس قدر ضروری چیز سمجھتے تھے اور لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لیے عصمت کے ابتدائی چھ سات سالوں میں انھوں نے فرضی زنانہ ناموں سے مثلاً س بیگم، ج بیگم، ص، ب اور احمد النساء وغیرہ ناموں سے اس لیے شائع کیا کہ عورتوں کو ایسے سیدھے سادھے مضامین پڑھ کر خود بھی کچھ لکھنے کی ہمت ہو۔ ان میں مذہبی مضامین بھی ہیں ان مضمونوں کی زبان بھی آسان ہے اور مذہبی احکام عام فہم مگر دل نشیں پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

راشدالخیری نے اپنے دور کی عورتوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تذلیل اور بربادی میں بہت بڑا دخل جہالت کا ہے۔ ان کے مکمل سکوت اور جمود نے ان کے ان مواقع کو بھی کچل کر رکھ دیا ہے جو ان کے ابھرنے میں معاون ہو سکتے تھے۔

"ہزار برس کی نیو" (عصمت 1910) میں بہو کی حالتِ زار کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے ساس انصاف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں:

"......بہت ہی کم گھرانے ایسے ہوں گے جہاں یہ خیال کیا جاتا ہو کہ یہ بیچاری، جس سے پہلے کی جان نہ پہچان، غیر جگہ کی رہنے والی، پر محلے کی بسنے والی، اپنے تمام عزیزوں اور رشتے داروں کو چھوڑ، پیاروں سے منہ موڑ، جو ہمارے یہاں آئی تو کس امید اور بھروسے پر؟ گھر کی ملکہ بننے آئی۔ ماں جیسی رفیق، باپ جیسا شفیق، بہن جیسی مونس، بھائی جیسا غمگسار، اس امید پر نثار کیے ہیں کہ اس گھر پر حکومت کرے گی نہ یہ کہ ساس، بہو کی تمام امیدوں کا خون اور ارمانوں کا خاتمہ کر دے.......ایمان والی ساسو......ان کی شرافت دیکھو کہ تمہارے ظلم سہیں اور اف نہ کریں، باتیں سنیں اور چپکی رہیں۔ جانتی ہیں کہ مرنا ہے اور بھرنا ہے، تم ان کو برا کہو رسوا کرو اور یہ مصیبت ماریاں تمہارے منہ تک کر خاموش ہو جائیں۔ گھر لانے کی لاج اور ساس بننے کی شرم یہ ہی ہے کہ اٹھتے جوتی بیٹھتے لات؟ کیڑے ان میں ڈالو، پھوہڑ انھیں بناؤ۔ بے ڈھنگا انھیں بتاؤ غرض میکے میں سگھڑ، نیک، سلیقہ والیاں کہلاتی تھیں، تمہارے یہاں قدم رکھتے ہی سو بروں کی بری ہوگئیں۔"

(ساقی، دہلی راشدالخیری نمبر ستمبر 1936 ص 70)

اس طرح بوڑھی اور بیوہ ساسوں پر ناعاقبت اندیش بہوؤں کی سختیوں کو قابل مذمت ٹھہرا کر بہوؤں کو بتایا ہے کہ جیسا سلوک وہ ساسوں کے ساتھ کرتی ہیں ان کو بھی اپنے آنے والی بہوؤں سے ایسے سلوک کی توقع رکھنی چاہیے۔

راشدالخیری نے اپنے تمام مضامین میں عورتوں پر ظلم وستم کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی نظر میں عورت کو پیدا ہوتے ہی مصیبت کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب تک عورتوں کی شادی نہیں ہوتی والدین کا ظلم سہتی ہیں، اور جب شوہر کے گھر جاتی ہیں تو نہ صرف شوہر کے ہاتھوں اس کی مٹی پلید ہوتی ہے بلکہ سسرال والے بھی جینا اجیرن کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بہن، بھائیوں، ساس بہوؤں، نند بھاوجوں وغیرہ نہ گفتہ بہ تعلقات پر بھی مضامین لکھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان سب کے تعلقات آپس میں کشیدہ نہ ہوں کیوں کہ ان کی زندگیاں تو پہلے ہی سے رنج والم سے گھری ہوئی ہیں۔

مولانا تمام عمر عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے ان میں ترکہ پدری، تعلیم و پردہ، عقد بیوگان اور خلع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے مختلف مضامین میں یہ بتایا کہ تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا لڑکے کے لیے۔ اس کے علاوہ عورتوں کو پردے کے بہانے گھر کی چہار دیواری میں قید رکھنا راشدالخیری کے خیال میں خلاف شرع تھا۔ کیوں کہ مرد کی طرح عورت کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ تازہ ہوا اور دنیا کی دیگر مناسب تفریحوں سے لطف اندوز ہو جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"کیا فرحت کا کوئی موقع ایسا تھا جو میسر آیا اور امہات المومنین اس سے لطف اندوز نہیں ہوئیں، حبشیوں کے گانے کے واقعہ میں ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی شرکت ہر مسلمان کو معلوم ہے لیکن یہ شاید عام مسلمانوں کو معلوم نہ ہو کہ ریس یعنی دوڑ میں ام المومنین اور ان کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی ہے اور دونوں ایک خاص نشان زدہ مقام پر دوڑے ہیں اور جس وقت سرور دو عالم آگے بڑھ گئے تو فرمایا، عائشہؓ! یہ اس روز کا بدلہ ہے جب تم آگے نکل گئی تھیں۔"

(ساقی، دہلی راشدالخیری نمبر ستمبر 1936 ص 74)

راشدالخیری بے پردگی اور اس آزادی نسواں کے حامی قطعی نہیں تھے جس میں عورت اور مرد کا امتیاز باقی نہ ہو۔ پردہ کرنا ان کے یہاں از حد ضروری تھا کیوں کہ اس سے مسلمان بہت سی مہلک برائیوں سے بچ جاتے ہیں۔

یادگار تمدن، حقوق نسواں کی حمایت میں راشدالخیری کے مضامین کا وہ مجموعہ ہے جو رسالہ تمدن میں ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا تھا۔ ہر مضمون سبق آموز اور نتیجہ خیز ہے جس میں عورت کی بے چارگی اور مظلومیت پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ ادب کے اعتبار سے بھی یہ مضامین راشدالخیری کی انشاپردازی کا معمولی کرشمہ ہیں۔

خاندان مغلیہ کی آخری جھلملاتی شمع گل ہو جانے کے بعد دلی پہ جو اداسی چھا گئی تھی اس کا گہرا اثر ان کی طبیعت پر تھا۔ مولانا کو ان لوگوں کی باتیں سننے کا

موقع ملا تھا، لاکھ تباہی اور بربادی کے باوجود جن کی نظر میں 1857 سے قبل کے دن سنہرے دن تھے۔ جو ان دنوں کا قصہ سناتے ہوئے خون کے آنسو روتے تھے۔راشدالخیری کی تحریروں پراس خون کے دھبے نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی خون کے آنسو روتے ہیں۔ لال قلعہ کی بہاریں لٹ چکی تھی۔دلی والے برباد ہوچکے تھے۔ جو بچ گئے تھے ان کو شہر بدر کردیا گیا تھا حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی مٹ گئی تھی۔ جب نفسی نفسی کا دور ختم ہوا تو دلی والے واپس آئے تو وہ دلی نہیں تھی جو شاہجہاں آباد سے عبارت تھی۔

دلی کی آخری بہار یہ کتاب راشدالخیری کی چند مضامین کا مجموعہ ہے ایک سوستائیس صفحات پر مشتمل ہے بھیکارن شہزادی، گلہری والی شہزادی، مچھیرن شہزادی، تیراکن اماں کی دل ہلا دینے والی داستانیں اسی سلسلے کی چند مثالیں ہیں اس کے علاوہ بہادر شاہ کی بھانجی کے مزاج حلیمی، طبیعت کا انکسار، خدا ترسی اور اقربا پروری ایسی باتیں ہیں جن سے دلی کی تہذیبی تصورات کا خاکہ یوں ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اہل دل اسے دیکھ کر بلبلا اٹھتے ہیں۔راشدالخیری بڑے رقیق القلب انسان تھے۔اپنے عہد کی ناہمواریوں کو دیکھ کر انھیں رنج ہوتا تھا۔اس لیے اگلے وقتوں کے قصے سنانے میں انھیں گونہ گوں مسرت حاصل ہوتی تھی۔اسی طرح راشدالخیری نے نواب احمد سعید خان اور مرزا فوگر کی دوستی کا جو حال بیان کیا ہے وہ اگلی وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔اور اپنے ایک مضمون میں ایام گزشتہ کی تفریحوں کی ایسی موثر تصویر کھینچی ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

’’ساون کا مہینہ تھا اور دو دن پہلے ہی سے قطب صاحب کے اندھیری باغ میں جھولے پڑ گئے تھے۔ اندھیری باغ تھا تو یہی مگر اس وقت کا باغ سچ مچ کا باغ تھا جہاں رستہ چلتوں کے سر پر چمپا اور مولسری کے پھول مہکتے تھے۔آموں کے جھنڈ اور اودی اودی جامنوں پر سبز طوطے اور ان کے لال لال کنٹھ۔ ایسا گنگا جمنی سماں اب کیا خاک دیکھنے میں آئے گا۔صبح چار ہی بجے سے مہمان پہنچ گئے۔اللہ کی رحمت بھی ایسی کہ سبحان اللہ یا تین دن سے آسمان تانبا ہو رہا تھا۔یا آدھی رات ہی سے سہاگنی گھٹائیں کالی کالی اور بھوری بھوری اٹھنی شروع ہوئی ہیں دن بھر میں جل تھل کردیا۔دوپہر کے بعد ذرا ہلکا ہوا۔پھوار پڑی تو شرابور لڑکیوں، بالیوں نے کڑھائیاں چڑھائیں پھوپھی آمنہ کی پھلکیاں، چچی شہزادی بیگم کے قلمی بڑی خالہ جان کے گلگلے ....دن بھر جو مزے رہے ہیں آنکھیں مرتے مرتے بھی ان کو نہیں بھول سکتیں۔ جھولے اب بھی ہوتے ہیں مگر اب جھولوں کا نام لینا ہمارے جھولوں کی ہنسی اڑانی ہے۔صبوری خانم نے جو ملہار گائے ہیں اور اس کی آواز گونجی ہے وہ کوئی کیا سنے گا۔‘‘

(سید ضمیر حسن دہلوی مرتبہ، دلی کی آخری بہار، اردو اکادمی دہلی،

2003 ص113,114)

اسی طرح راشدالخیری نے اپنے ایک مضمون میں برسات کی تفریح کچھ یوں دکھائی ہے:

’’کیا وقت تھا مینھ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے۔اور عورتیں کھانے پینے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔کوئی آم باندھ رہی ہے۔اور کوئی اپنے دودھ پیتے بچے کو گھرک رہی ہے جو اتفاق سے جاگ اٹھا ہے.....سواریاں بیٹھنی شروع ہوئیں۔ایک بھارکس آٹھ دس سواریاں، دس بارہ بچے۔ایک کے اوپر ایک۔ جب سب بیٹھ گئے تو بھارکس روانہ ہوئی۔شہر کے فصیل سے نکل کر تین چار بیویاں اتر گئیں کچھ دور پیدل چلیں پھر بیٹھ گئیں اور دوسری اتریں۔ نیچے اترنے والیاں جن کے ساتھ محلے کے بھی غریب غربا ہیں برسات کے گیت گا رہی ہیں۔مولوی صاحب اور ماموں مغل پیچھے ہیں۔سڑک والی عورتیں لہک رہی ہیں اور گاڑی والیاں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ آگیا۔ماموں مغل نے جھولا پہلے ہی ڈلوا دیا تھا۔پانچ چار جھولے کو لپٹیں باقیوں نے کڑھائی چڑھائی۔ پالک، قلمی بڑے، سہال پھلکیاں، گرم گرم اتر رہی ہیں اور جھولے والیاں زور شور سے لہک لہک کر ملہار گا رہی ہیں۔‘‘

(سید ضمیر حسن دہلوی مرتبہ، دلی کی آخری بہار، اردو اکادمی دہلی،

2003 ص115,116)

راشدالخیری کے مضامین میں نازک خیالی و رنگین بیانی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔شاعرانہ نثر کے علاوہ منظوم ٹکڑے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔خوبصورت الفاظ جچے تلے جملے دہلی کی صاف ستھری زبان میں ہم آہنگی اور ایک قسم کی موسیقی جو پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شاعرانہ دل ودماغ لے کر آئے تھے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اسے کلام موزوں کی صورت میں نہیں بلکہ موزوں ترین الفاظ میں ادا کر رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہی لطف آتا ہے جو کسی اچھے شعر کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ان کے بعض مضامین میں شعریت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ نظم ونثر کی سرحدیں مل جاتی ہیں ’’قلب حزیں‘‘ میں بہار شب کا منظر اس طرح بیان ہوا ہے:

’’گرمیوں کے دنوں میں جب کائنات نے رات کا خاموش لباس پہن لیا تو پہاڑ کی چوٹی سے چاند نے جھانکنا شروع کیا۔ چاندی کے ورق ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ہوا ادھر ادھر اچھلتی پھرتی تھی۔مگر بلبل کی خاموشی اور وداع آفتاب نے فضا عالم میں ایک سناٹا پیدا کردیا تھا۔آبشار کی سنہری بانسری جو چمن سے دور بج رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنی میٹھی تانوں سے درختوں کو چونکا دیتی تھی اور پھر دنیا سنسان ہو جاتی تھی۔رات قدرت کے آب رواں میں غسل کر رہی تھی۔یاسمین وگلاب پھریریاں لے لے کر پانی کے قطرے موتیوں کی صورت میں کائنات دہر پر نثار کر رہے تھے۔‘‘

(قلب حزیں، مطبوعہ، ساقی، دہلی راشدالخیری نمبر ستمبر 1936ء ص33 سے اقتباس)

راشدالخیری کا قلم گونا گوں قوتوں کا مالک ہے کبھی وہ سیدھے سادھے لفظوں میں حقائق و واقعات کی مرقع کشی کرتے ہیں تو کبھی ان حقائق و واقعات کو ایک شاعر کی طرح رنگین بیانی کا ایک جامہ پہنا دیتے ہیں۔ یہ رنگین بیانی اپنے اندر اس قدر اثر رکھتی ہے کہ اس کے پڑھنے سے قاری پر بالکل ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی اچھے شعر کے سننے سے پیدا ہوسکتی ہے۔’’وداع خاتون‘‘ میں راشدالخیری نے اپنی بہو خاتون اکرم کی زندگی کو ایک پودے سے تشبیہ دی ہے اور چند جملوں میں مرحومہ کی زندگی اور موت کا نقشہ کھینچا ہے:

’’باغبان کی ہزار ہا توقعات کے سایہ میں ننھا سا پودہ لہلہا لہلہا کر پروان چڑھ رہا تھا۔ سبز پتیاں دن بھر تمازت آفتاب کے آغوش میں پھولتیں اور رات کو جب متحرک ذرات خاموش ہوجاتے تو پودا سرسرا کر ہوا سے اٹھکیلیاں کرتا۔شبنم کے آبدار موتی اس کا منھ چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمۂ شب پر صبا ٹھنڈے

جھونکوں کا غسل دیتی۔ پودہ بڑھ رہا تھا سرسراسرسرا کر لہلہا لہلہا کر، کس کو خبر تھی کہ یہ پودا کیسے کیسے گل کھلائے گا۔ اس کا پہلا پھول بہار حسن کو معطر کرے گا۔ اور شرمگیں نگہ عروس اس کی خوشبو سے ہم کنار ہوتی ہوئی بلند ہوگی۔ اس کی نازک پنکھڑیاں شب عروس کی گود میں کھیلیں گی، اور سرخ آویزے ان کی بہار پر قربان ہوں گے۔ پودا پروان چڑھ رہا تھا پھول پھول کر اور جھوم جھوم کر۔"

(علامہ راشدالخیری، وداع خاتون، عصمت بک ایجنسی دہلی، تیسری بار، 1931 ص4)

اب خزاں کا وہ مرقع بھی دیکھئے جس کو راشدالخیری نے اس کے بعد ہی پیش کیا ہے:

"جب بہار خزاں سے بدلے گی اور لو کے تند و گرم جھونکے شاداب و سبز پتوں کو جھلسیں گے، ہری ہری کونپلیں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کا دامن بھریں گی، اس وقت یہ نازک پودہ اپنی پوری طاقت سے خزاں کے مقابلہ کو آگے بڑھے گا، ایک دردانگیز کشمکش ہوگی اور نظام عالم کا ایک پر لطف قہقہہ جو بجلی بن کر گرے گا، فتح کا سہرا، خزاں کے سر باندھتا ہوا اس ہونہار پودے کو تاراج و برباد کردے گا لیکن اس سے کچھ پہلے، جب بلبل آخری مرتبہ شاخ گل پر جھولے گی، یہ آخری پھول مرجھانے سے قبل ہوا کو بدستور معطر کرے گا! کون جانتا تھا جس کا پہلا پھول زینت عروس تھا اس کا آخری پھول آرائش قبر ہوگا! جس کے پہلے پھول نے دلہن بنایا اسی کو آخری پھول قبر میں دیکھے گا۔"

(علامہ راشدالخیری، وداع خاتون، عصمت بک ایجنسی دہلی، تیسری بار، 1931 ص4,5)

وداع خاتون میں ایک مضمون تعزیت نامہ ہے جس کو راشدالخیری نے اپنے سمدھی کو لکھا تھا اس کی ایک ایک سطر درد و غم میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"....اس کی آرزو تھی کہ شوہر کے ہاتھ سے پیوند زمین ہو آج آپ کی بچی کا ارمان پورا ہوتا ہے! آپ نے مجھے اس کے نکاح میں شریک کیا جو پھولوں میں مہک رہی تھی میں آپ کو اس کے دفن میں بلاتا ہوں، جو کافور میں ڈوبی ہوئی ہے، آپ نے وداع کے وقت اس کی آنکھ میں آنسو دیکھے ہوں گے۔ لیکن میں نے مرض الموت میں بھی اس کی آہ نہ سنی، بخار تھا فالج تھا، سرسام تھا۔ مگر زبان پر ہائے نہ تھی کلیجہ کٹتا ہے جب خیال کرتا ہوں کہ دم واپسیں میں مجھ کو بلایا زبان بیکار تھی دورے پڑ رہے تھے، شرم و حیا کی مجسم تصویر نے سر ڈھکنے کی ہر چند کوشش کی، لیکن ہاتھ نہ اٹھا۔ شکریہ کی کیفیت آنکھ میں اور منت و عجز کے آثار چہرے پر ظاہر ہوئے اور روتی ہوئی آنکھوں سے اپنا لال میرے سپرد کرکے آنکھیں بند کرلیں۔"

(علامہ راشدالخیری، وداع خاتون، عصمت بک ایجنسی دہلی، تیسری بار، 1931 ص32,33)

بزم رفتگاں میں مولانا نے اپنے ان دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی یادوں پر دردانگیز مضمون یکجا کیے ہیں جو فوت ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک مضمون جسے راشدالخیری نے اپنے بزرگ استاذ نذیر احمد کے انتقال پر لکھا تھا۔ یہ مضمون گویا ایک مرثیہ ہے جو نثر میں لکھا گیا ہے اور اس کا ہر لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے اس کا ایک اقتباس کچھ اس طرح ہے:

"بے نظیر تھیں اور لاجواب بے مثل تھیں اور نایاب وہ پاک اور صاف روحیں جو عالم حیات میں ہشاش بشاش آئیں شاداں و فرحاں رہیں اور شگفتہ و خنداں رخصت ہوئیں۔ دنیا ان کے فراق ابدی پر خون روئی آسمان اور زمین ان کی موت پر بیتاب ہوئے۔ زندوں نے ان کا ماتم اور مردوں نے ان کا غم کیا۔ اپنوں نے سر پیٹے غیروں نے آہ اور سننے والوں نے واہ کی۔ ان کی رخصت عزیزوں کی بربادی ان کا کوچ دوستوں کی بدنصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی۔"

(عصمت راشدالخیری نمبر، جولائی اگست 1936 ص216)

راشدالخیری زندگی کے نت نئے مسائل کا باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے قائل تھے بالخصوص خواتین کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر سے شادی کا انتخاب بھی ایک دشوار ترین مسئلہ تھا۔ انھوں نے اپنے مختلف مضامین میں ضمناً اس موضوع پر بحث کی ہے لیکن علاحدہ ایک مستقل کتاب اکتوبر 1935 میں لکھنی شروع کی تھی مگر موت نے مذکورہ کہانی کی تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ بعد میں ان کے فرزند رازق الخیری نے اسے مکمل کرکے شائع کیا جس میں راشدالخیری نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا:

"ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ کسی اہم مسئلہ سے کم نہیں ہے۔ بہت کم خاندان ہوں گے جہاں والدین پریشان نہ ہوں کہ جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں اور بر نہیں جڑتے۔ لڑکیاں اس معاملے میں دم بخود ہیں اور والدین بھی خود کو حالات کے تحت کرنے پر مجبور۔ لڑکیاں شادی کے وقت کیا کریں؟ مذہب اسلام نے ان کو کیا حق دیا ہے؟ دنیا کی ضرورتیں اور سوسائٹی ان کو کس قدر اختیارات دے رہی ہے یہ سب باتیں انھیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔ بر کے انتخاب میں لڑکے کی مالی حالت اور حسب و نسب کا تو خیال رکھا جاتا ہے مگر لڑکے کی ذاتی شرافت، اس کی عادات و خصائل، اس کے طور طریقے، اس کے خیالات اور توقعات، اس کی عمر اور صحت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسے اپنی ذمہ داریوں کا کس حد تک احساس ہے۔ اسی طرح دلہن کے انتخاب میں حسن، دولت، اعلیٰ تعلیم کی تلاش تو ہوتی ہے مگر اس کی چھان بین نہیں کی جاتی کہ لڑکی خانہ داری ذمہ داریوں کو کس حد تک اٹھا سکتی ہے؟ وہ سلیقہ شعار، ہنرمند، منتظم اور کفایت شعار بھی ہے یا نہیں۔"

(علامہ راشدالخیری، شادی کا انتخاب، عصمت بک ایجنسی دہلی، پہلی مرتبہ، جولائی 1938 ص الف)

راشدالخیری کی زبان میں دلی کے بے شمار محاورات استعمال ہوئے ہیں ضرب الامثال بھی بکثرت آگئے ہیں ان کی تصانیف طبقہ نسواں کی اصلاح کا اچھا ذریعہ ہیں۔

الغرض ازدواجی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر علامہ جیسے حساس مصنف کی نگاہ برابر رہی انھوں نے اپنی تمام تصانیف میں طبقۂ نسواں کی بہتری کے لیے کوشش کی ہے۔ وہ عورتوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا ظلم اور ناانصافی برداشت نہیں کرسکتے تھے اگرچہ ان کی تخلیقات میں پند و نصائح کبھی کبھی فن پر غالب آگئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریروں میں فن اور زندگی کا توازن برقرار رہا ہے، اور ان کا دردمند دل ہمیشہ طبقہ نسواں کے لیے بے چین رہا ہے۔ ●●

سوانحی اشارے نندکشور وکرم

نام: نندکشور دت
قلمی نام: نندکشور وکرم
والد کا نام: شری رام لال دت
والدہ کا نام: شریمتی گومتی دت
دادا کا نام: گنڈا مل دت
دادی کا نام: بھاگ ونتی
ولادت: ۷ا ستمبر ۱۹۲۹ء راول پنڈی شہر (پاکستان)
آبائی وطن: اراضی چھپراں تحصیل کہونہ ضلع راولپنڈی (پاکستان)
تعلیم: بی اے (۱۹۵٦ء پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ) ایم اے فارسی (۱۹۵۸ء پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ) ایم اے اردو (۱۹٦٦ء دھلی یونیورسٹی، دھلی) ادیب فاضل (۱۹٦۱ء، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ) فلم اینڈ ٹی وی انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، پونے سے سرٹیفکٹ برائے فلم اپری سی ایشن
ملازمت:
۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو سنٹرل انفارمیشن سروس سے سبکدوش۔
شادی: اا مئی ۱۹٦۱ء اہلیہ: آشا دت (پیدائش ۲۸ا کتوبر ۱۹۴۰ء۔ وفات ۴ اپریل ۲۰۱۳ء کینسر سے)
بچوں کے نام: تین بچے۔ رتو ملہوترا (بیٹی)، وکاس دت (بیٹا) اور جوہی بالی (بیٹی)
پہلی تخلیق: دسمبر ۱۹۴۷ء میں افسانہ ''ادیب'' ماہنامہ ''نرالا'' نئی دھلی میں شائع ہوا۔
صحافت: ۱۹۴۸ء میں کانپور میں پنجاب کے مشہور صحافی میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ ''قومی اخبار'' اور ''امرت'' سے وابستہ رہا۔
۱۹۴۹ء میں کانپور ہی سے دیویندر اسر کے اشتراک سے ماہنامہ ''ارتقاء'' کا اجراء کیا جو بوجوہ بند ہو گیا۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں نئی کہانی کی ادارت کی۔ ۱۹٦۴ء تا ۱۹۷۹ء سرکاری رسالے ''آج کل'' نئی دھلی میں بحیثیت سب ایڈیٹر / اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ رہا۔ اب ۱۹۸۵ء سے اردو کے واحد حوالہ جاتی مجلّے ''عالمی اردو ادب'' کی ادارت ۲۰۱۹ء تک نندکشور وکرم نے کی۔
رکن: ۱۹۱۸ء سے تاحیات اردو مشاورت بورڈ، ساہتیہ اکادمی، نئی دھلی۔
وفات: ۲۷ا اگست ۲۰۱۹ء
پتہ: ایف ۲۱/ ۱۴ا (ڈی) کرشن نگر، دھلی۔ ۱۱۰۰۵۱
انعامات و اعزازات: ۱۹۷۰ء میں ''کواپریٹو ڈیری پر وزارت زراعت، حکومت ہند کا انعام۔ ۱۹۷۳ء میں ''سفید انقلاب'' مسودے پر وزارت زراعت حکومت ہند کا انعام۔ ۱۹۸۱ء میں ناول یادوں کے کھنڈر پر اتر پردیش اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی انعام۔
۱۹۹۸ء میں افسانوی مجموعے ''آوارہ گرد'' پر دھلی اردو اکادمی کا انعام۔
۲۰۰۱ میں تجزیاتی ناول ''انیسواں ادھیائے'' پر دھلی اردو اکادمی کا انعام جو قبول نہیں کیا۔
۲۰۰٦ء میں اردو اکادمی دھلی نے تخلیقی نثر پر اعزاز عطا کیا۔
۲۰۰۸ء رائیٹرز فاؤنڈیشن پاکستان کی انٹرنیشنل اردو کانفرنس کی جانب سے اعزازی مومنٹو۔
۲۰۰۹ء غالب انسٹیٹیوٹ نئی دھلی کی جانب سے مجموعی خدمات پر غالب ایوارڈ۔
۲۰۰۹ء دھلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی گولڈن جوبلی کے موقع پر مومنٹو
۲۰۱۳ء میں سترہواں عالمی فروغ اردو (قطر) کا ڈیڑھ لاکھ روپے کا ایوارڈ۔
۲۰۱۵ء استنبول یونیورسٹی (ترکی) کے شعبہ اردو کے قیام کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔
۲۰ مئی ۲۰۱۷ء کو آل انڈیا قومی ایکتا منچ کولکاتا کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔
۲۰۱۷ء میں غالب اکادمی۔ نئی دھلی کی جانب سے قدر افزائی۔
اردو سے ہندی میں ترجمے پر ایوارڈ پریشد، نئی دھلی کا ۹۹-۱۹۹۸ دویوا گیش پرسکار۔
۱۹۹٦ء میں ہندی میں تخلیقی ادب اور صحافت میں نمایاں کارکردگی پر ''سنگھ کی آواز'' کی جانب سے فلکی آڈیٹوریم، نئی دھلی میں اعزاز دیا گیا۔
بیرونی ممالک کے اسفار فرانس، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا (۱٦ اگست ۱۹۸۳ء تا ۲ فروری ۱۹۸۴ء) امریکہ کینیڈا (۲۰۰۵ء) نیپال (۱۹۸۱ء)، پاکستان (۳ دسمبر تا ۱۴ دسمبر ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۹ء)، لاہور میں منعقد احسن کانفرنس میں شرکت (۲۱ دسمبر ۲۰۱۳ء)، قطر (۲۰۱۳ء)، ترکی (استنبول ۲۰۱۵ء)

مطبوعات اردو

غالب حیات وشاعری (۱۹٦۹ء) مشورہ بک ڈپو، رام نگر، دھلی۔ ۱۱۰۰۵۱
یادوں کے کھنڈر (ناول ۱۹۸۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
آوارہ گرد (افسانے ۱۹۹۸ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
انیسواں ادھیائے (ناول ۲۰۰۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
آدھا سچ (افسانے ۲۰۰۷ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
مصور تذکرے (۲۰۱۲ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
ہنس راج رہبر کے افسانے (کلیات ۲۰۱۲ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
کچھ دیکھے کچھ سنے (۲۰۱۳ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
ایک مفکر ایک دانشور: دیویندر اسر (۲۰۱۳ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
شباب للت: شخصیت اور ادبی خدمات (۲۰۰۷ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱
کرشن چندر (مونوگراف) اردو اکادمی، دھلی
علی عباس حسینی کی کہانیاں (کلیات جلد اول ۲۰۱۵ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی۔ ۵۱

علی عباس حسینی کی کہانیاں (کلیات جلد دوم ۲۰۱۲ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

سدرشن (مونوگراف جون ۲۰۱۷ء) ساہتیہ اکادمی، نئی دھلی ۔ا

کشمیری لال ذاکر ایک ہمہ جہت شخصیت (۲۰۱۷ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

مصور: اردو کے ایک سو شاعر، بک کارنر، جہلم پاکستان (۲۰۱۷ء)

ادھوری کلیات (افسانے ۲۰۱۷ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

بھولے بسرے مجاہد (۲۰۱۸ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

منتخب افسانے ۱۹۸۴ء تا ۲۰۱۰ء (ہر سال کا انتخاب) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

بچوں اور تعلیم بالغان سے متعلق کتابیں

محمد حسین آزاد (مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی

کواپریٹو ڈیری (اس پر حکومت ہند کی جانب سے ایک ہزار کا انعام ملا مطبوعہ پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دھلی)

سفید انقلاب، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

(مسودے پر حکومت ہند کی جانب سے ایک ہزار روپے کا انعام)

سنیما کی کہانی (۲۰۱۴ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

بابا کھڑک سنگھ (۱۹۹۶ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

گورو رام سنگھ نامدھاری (۱۹۹۵ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

سوامی رام تیرتھ (۱۹۹۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

جلیاں والا باغ (ہندی سے اردو ترجمہ) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دھلی

گومکھ یاترا (ہندی سے اردو ترجمہ) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دھلی

نند کشور وکرم پر رسائل کے گوشے اور خصوصی نمبر

ماہنامہ ’چہارسو‘ راول پنڈی، مئی جون ۲۰۰۷ء میں ’’قرطاس اعزاز‘‘ کے عنوان سے گوشہ

سہ ماہی ’روشنائی‘ کراچی اپریل ۔ جون ۲۰۱۱ء میں گوشہ

سہ ماہی ’کاروان ادب‘ بھوپال (جلد ہفتم شمارہ ۲۳) میں مختصر گوشہ

۷۹ ویں یوم پیدائش کے موقع پر ماہنامہ ’مکالمات‘ دھلی کا ستمبر ۲۰۰۸ء کا خصوصی نمبر

سہ ماہی ادب سلسلہ، دھلی، جنوری تا جون ۲۰۱۷ء، شمارہ نمبر ۴ کا خصوصی گوشہ (صفحہ ۲۶۲ تا ۳۲۰)

۸۰ ویں سال گرہ پر غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دھلی میں منعقدہ تقریب میں ’’فرہادِ لوح و قلم نند کشور وکرم‘‘ مرتبہ فاروق ارگلی کی پیشکش ۲۰۰۹ء

ہندی کتابیں

یادوں کے کھنڈر (ناول ۔۱۹۶۱ء) نویگ پرکاش، بینگلو رروڈ، دھلی ۔۱۱۰۰۰۷

آوارہ گرد (افسانے ۔۲۰۰۰ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول ۔۲۰۰۳ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

آدھا سچ (افسانے ۔۲۰۱۰ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

سعادت حسن منٹو (منٹو شناسی) ۲۰۱۵ء، ساکشی پرکاشن، شاہدرہ دھلی

ایک سو شاعر (۲۰۱۷ء) ساکشی پرکاشن، شاہدرہ روڈ، دھلی

اردو سے ہندی تراجم

آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر کا ناول) (۲۰۰۰ء) اندر پرستھ پرکاشن، کرشن نگر، دھلی ۱۱۰۰۵۱

تصویریں (سعادت حسن منٹو کے تحریر کردہ خاکوں پر مبنی کتاب کا ترجمہ و تدوین) (۲۰۰۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

پاکستان کی شریشٹھ اردو کہانیاں، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

’’اردو کہانی کار سیریز‘‘ کے تحت ہندی کتابیں

پریم چند (۱۹۹۶ء)، راجندر سنگھ بیدی (۱۹۹۶ء)، عصمت چغتائی (۱۹۹۶ء)
احمد ندیم قاسمی (۱۹۹۶ء)، غلام عباس (۱۹۹۶ء)، ہنس راج رہبر (۱۹۹۶ء)
سعادت حسن منٹو (۱۹۹۷ء)، سدرشن (۱۹۹۸ء)، قرۃ العین حیدر (۱۹۹۸ء)
کرشن چندر (۱۹۹۸ء)، ممتاز مفتی (۱۹۹۹ء)، خواجہ احمد عباس (۱۹۹۹ء)
علی عباس حسینی (۲۰۰۰ء)، حیات اللہ انصاری (۲۰۰۰ء)، دیویندر ستیارتھی (۲۰۰۰ء)
رام لعل (۲۰۰۰ء)، اپندر ناتھ اشکؔ (۲۰۰۱ء)، بلونت سنگھ (۲۰۰۱ء)، انتظار حسین (۲۰۰۱ء)،
اور کشمیری لال ذاکر (۲۰۰۱ء) کی اشاعت اندر پرستھ پرکاشن، کرشن نگر، دھلی ۔۱۱۰۰۵۱ سے ہوئی ہے۔

’’شاعری اور جیون‘‘ کے تحت اردو شعرا کی سیریز ہندی میں

اردو کی سروشریشٹھ کہانیا (۲۰۰۲ء) ساکشی پرکاشن، دھلی ۔۱۱۰۰۳۲

اردو کی سروشریشٹھ ہاسیہ کہانیاں (۲۰۰۲ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

سردار جعفری: شاعری اور جیون (۲۰۰۲ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

منٹو کی سروشریشٹھ کہانیاں (۲۰۰۴ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

حبیب جالب: شاعری اور جیون (۲۰۰۶ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

غالب: شاعری اور جیون (۲۰۰۶ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

ساحر لدھیانوی: شاعری اور جیون (۲۰۰۶ء) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

پاکستان کی سروشریشٹھ اردو کہانیاں (۲۰۰۷ء) ساکشی پرکاشن، دھلی ۔۱۱۰۰۳۲

عصمت چغتائی کی سروشریشٹھ کہانیاں (۲۰۰۹ء) ساکشی پرکاشن، دھلی ۔۱۱۰۰۳۲

اردو کے سو پرسدھ شاعر اور ان کی چنندہ شاعری (۲۰۱۷ء) ساکشی پرکاشن، دھلی ۔ ۱۱۰۰۳۲

ہندی سے اردو ترجمہ

گرہ داہ (شرت چندر چٹرجی کا ناول (۱۹۷۱ء) مشورہ بک ڈپو، رام نگر، دھلی ۔۱۱۰۰۵۱

پنجابی سے اردو ترجمہ

نہ رادھا نہ رکمنی (امرتا پریتم کا ناول) (۲۰۰۳ء) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دھلی

جنگی قیدی (کیسر سنگھ کا ناول) (۲۰۰۳ء) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دھلی

انگریزی سے اردو ترجمہ

گیانی ذیل سنگھ (۱۹۹۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی ۔۵۱

یوسف مہر علی (۲۰۰۴ء) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دھلی ●●

”حیاتِ مبارکہ حیدر“

فرحت نواز (رحیم یارخان)

”حیاتِ مبارکہ حیدر“ اپنی نوعیت کی ایک بالکل انوکھی اور دلچسپ کتاب ہے۔ 27 مئی 2019ء کو جرمنی میں مقیم معروف شاعر اور ادیب حیدر قریشی کی اہلیہ مبارکہ حیدر وفات پا گئیں۔ تب ہی حیدر قریشی نے اپنی اہلیہ کے ساتھ 48 سالہ رفاقت کا حال کچھ لکھنا اور کچھ مرتب کرنا شروع کر دیا۔ 16 اگست کو کتاب مکمل ہو گئی اور اب چھپنے کے بعد قارئین تک پہنچ چکی ہے۔ ”حیاتِ مبارکہ حیدر“ 256 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں کتاب ”ہماری امی مبارکہ حیدر“ مرتب کردہ شعیب حیدر جوں کی توں شامل کی گئی ہے۔ 96 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2015ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر ڈاکٹر انور سدید کا یہ تبصرہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

”اب یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حیدر قریشی کی تحریروں سے مرصع کی گئی ہے اور وہی اس کے بنیادی اور اولین مصنف ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ”ہماری امی“ اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے جس کی ترتیب و تدوین پر حیدر قریشی کے بچے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سرورق پر مبارکہ حیدر کی تصویر ہے۔ یہ تصویر ان کی اپنی ہے لیکن سر پر ٹوپی حیدر قریشی کی ہے جو ان کے ”سرتاج“ ہیں۔“

دوسرے حصے میں ”ہماری امی مبارکہ حیدر“ پر لکھے گئے تبصرے، تاثرات اور مضامین شامل ہیں۔ اس حصہ میں ڈاکٹر انور سدید، گلزار، ترنم ریاض، صادق باجوہ، ناصر علی سید، سید نصرت بخاری، عظیم انصاری، پروفیسر عبدالرب استاد، نسیم انجم، ڈاکٹر رضینہ خان، ڈاکٹر قمر النساء، خالد یزدانی، حمیرا حیات، زارا حیدر اور فیصل عظیم کے تاثرات اور مضامین شامل ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصے میں مبارکہ حیدر کی وفات کی خبر اور تعزیتی پیغامات شامل ہیں۔ وفات کی خبر روزنامہ نوائے وقت (خالد یزدانی۔ لاہور)، پنجند ڈاٹ کام (وقاص سعید۔ آسٹریلیا) اور صبحِ اردو (شاہد ماہلی۔ دہلی) نے اپنے اپنے طور پر شائع کی۔ اس حصے میں عبدالرب استاد اور طاہر عدیم کے منظوم تاثرات بھی شامل ہیں۔
صفحہ نمبر 151 سے 164 تک دنیا بھر سے ملنے والے تعزیتی پیغامات کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

چوتھے حصے میں ”جذبات و احساسات“ کے تحت مندرجہ ذیل ادبی احباب اور قریبی رشتہ داروں کے مضامین میں شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں صادق باجوہ، عبداللہ جاوید، شہناز خانم عابدی، ڈاکٹر ریاض اکبر، نازیہ خلیل عباسی، خالد یزدانی، راحت نوید، عظمیٰ احمد، کنول تبسم اور نذیر بزمی شامل ہیں۔

کتاب کا پانچوں اور آخری حصہ ”یادیں ہی یادیں“ ہے۔ اس میں حیدر قریشی کے پانچوں بچوں درِ ثمین انور، طارق محمود حیدر، رضوانہ کوثر، عثمان حیدر، اور شعیب حیدر کے مضامین شامل ہیں جو اپنی والدہ مبارکہ حیدر کی خوشگوار یادوں سے معمور ہیں۔ ان یادوں سے مبارکہ کی زندگی کے مزید روشن پہلو سامنے آتے گئے ہیں۔ یہ مضامین جیسے جیسے لکھے گئے ویسے ویسے مختلف اخبارات اور ویب سائٹس پر چھپتے گئے۔ اس کے نتیجہ میں ہر مضمون پر قارئین کے تاثرات بھی موصول ہوتے رہے۔ چنانچہ ہر مضمون کے بعد موصولہ تاثرات بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس حصے کا سب سے اہم مضمون حیدر قریشی کا ”پسلی کی ٹیڑھ“ ہے۔ حیدر قریشی نے انتیس سال پہلے اسی عنوان سے مبارکہ کا خاکہ لکھا تھا اور اب ان کی وفات پر ”پسلی کی ٹیڑھ“ کا دوسرا حصہ قلم بند کیا ہے۔ یہ ذاتی طور پر بھی اور ادبی طور پر بھی ایک شاندار فن پارہ ہے۔ اس کے بعد حیدر قریشی نے ”کچھ اور یادیں، کچھ اور باتیں“ کے عنوان سے مبارکہ کی مزید یادیں لکھی ہیں۔ اسی حصہ میں مصری ریسرچر احمد عبدربہ عباس کے عربی مقالہ کا ایک اقتباس، اور کنول رعنا نوشی کا تاثراتی مضمون بھی شامل ہے۔ آخر میں حیدر قریشی نے اپنے والد کے دو خواب درج کرنے کے ساتھ ان کی تعبیر کے چند اہم شواہد پیش کیے ہیں۔

”حیاتِ مبارکہ حیدر“ پیش لفظ سے لے کر آخر تک ہماری ادبی دنیا کے لیے ایک پیغام دے رہی ہے۔ ہمارے ادیبوں نے دنیا جہان کے موضوعات کھنگال لیے۔ انہیں چاہئے کہ اپنے بہت ہی قریبی اور پیارے عزیزوں کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنائیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے لکھا تھا ”حیدر قریشی نے اسے (خاکہ کو) اپنی اہلیہ کی یادوں سے سجایا تھا اور انہیں بیوی کی بجائے ایسے مخلص ترین دوست کا درجہ دیا تھا جو بدخواہوں سے ورغلایا نہیں جا سکتا۔“ یہ تو جیتے جی کی بات ہے مبارکہ نے تو اپنے اور حیدر قریشی کے رشتے کے بارے بہت پہلے یہ لکھ دیا تھا کہ ”رشتہ بہت ہی پکا ہے۔ مرنے کے بعد بھی نہ ٹوٹنے والا۔“ (فلیپ سے ماخوذ)

یہ حقیقت ہے کہ مبارکہ کے جیتے جی بھی ان کے رشتہ کو توڑنے کی سازش کرنے والے ناکام و نامراد رہے تھے اور اب ان کی وفات کے بعد بھی ایسی کوئی شرارت کرنے والے ناکام و نامراد ہی رہیں گے۔

”حیاتِ مبارکہ حیدر“ حیدر قریشی اور مبارکہ حیدر کی بحیثیت میاں بیوی 48 سالہ محبت اور رفاقت کی لازوال داستان ہے۔ ●●

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب وثقافت

ستمبر 2019

سرپرست اعلیٰ

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

مدیر

پروفیسر محمد ظفرالدین

ناشر: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشنز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۲ (تلنگانہ)

9347690095

adabosaqafatmannu@gmail.com

رسالہ

جامعہ

مدیر

محمد اسحاق

نائب مدیر

تجمل حسین خاں

The Monthly Jamia ISSN 2278-2095

جلد نمبر ۱۱۶، شمارہ: ۱، ۲، ۳/ جنوری-مارچ ۲۰۱۹

اس شمارے کی قیمت (اندرون ملک) ۱۰۰ روپئے

(غیر ممالک سے)   ۱۲/ امریکی ڈالر

سالانہ (اندرون ملک) ۳۸۰ روپئے

(غیر ممالک سے) ۴۰۰/ امریکی ڈالر

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد

ٹائٹل: اسلم آرٹ

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

Website:www.jmi.ac.in/zhiis

E-mail:zhis@jmi.ac.in

مصنف: رمیش پوکھریال نشنک

مترجم: محمد نہال افروز

قطرہ قطرہ موت

(ترجمہ: ہندی سے اردو)

گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں پسینہ بہاتی 'کنتی' سر پر دھوتی کا کنارہ باندھے کھیتوں کی کٹائی کر رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہنسیا بار بار پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔ پسینہ پونچھنے کے چکر میں دھوتی سے مٹی چپک جاتی تھی۔ دھوتی کا اصل رنگ کیا تھا یہ تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا اور دھوتی پر جگہ جگہ گانٹھیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ جہاں دھوتی پھٹتی، وہیں پر کنتی گانٹھ باندھ لیتی تھی۔ گن چن کر اس کے پاس دو تین ہی تو دھوتیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کو شادی بیاہ میں جانے کے لیے بھی محفوظ رکھنا تھا۔

مگر جب سے اس کا شوہر 'منکسیر' دلی رہنے لگا تھا، تب سے اس کی بھی زندگی تھوڑی سی بدل گئی تھی۔ وہ اس کے لیے دو چار ساڑیاں تو لے ہی آیا تھا، لیکن وہ انہیں کھیتوں میں مزدوری کرتے وقت تو نہیں پہن سکتی تھی۔

اف...... کتنی گرمی ہے۔ آسمان سے تو مانو آگ برس رہی تھی۔ ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہوگا؟ کنتی کا گلا سوکھ آیا۔ چھوٹے چھوٹے سیڑھی نما کھیت، لیکن آس پاس کوئی پیڑ نہیں۔ کنتی کے دل میں آیا کہ تھوڑی دیر کہیں سائے میں بیٹھ کر پانی پی لے۔ مگر سایہ نصیب نہیں ہوا۔ کنتی پلاسٹک کی ایک بوتل میں پانی بھر کر لائی تھی، جواب ابلنے لگا تھا۔ یہ پلاسٹک کی بوتل پچھلے ہی مہینے منکسیر و نے اسے لا کر دی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ ان بوتلوں میں شہر میں پانی بیچا جاتا ہے۔ سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔

''پانی! یہ بھی کوئی بیچنے کی چیز ہے بھلا۔''

''ارے تو کیا جانے کیا کیا ہوتا ہے شہر میں؟'' کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کی یہ چمک کنتی کو بہت ڈراونی لگی تھی۔ کہیں اس کا منکسیر و شہر کی چکا چوندھ میں گم نہ ہو جائے۔

کنتی نے دو گھونٹ پانی سے اپنی زبان اور گلے کو تر کیا اور پھر گیہوں کاٹنے لگی۔ اس بار تو فصل بھی اچھی ہوئی تھی۔ منکسیر و یہاں ہوتا تو وہ دو چار کھیت اور بٹائی پر لے سکتی تھی، لیکن اسے تو نہ جانے کیا سوجھی، شہر جا کر نوکری کرنے کی۔ وہاں کسی بڑی حویلی میں نوکری کر رہا ہے۔ منکسیر و گاؤں میں تھا تو دونوں مل کر ایک نہیں دو دو خاندانوں کے پورے پورے کھیت بٹائی پر لے لیتے تھے۔

کنتی جب پندرہ سال کی تھی تب اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی۔ گھر میں سسر اور دو چھوٹے دیور تھے۔ ساس کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ دو بیٹیاں تھیں۔ ان کی بھی شادیاں ہو چکی تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہیں تھی اس لیے منکسیر و کی شادی کر دی گئی۔ اس وقت وہ بیس سال کا تھا۔

یوں تو 'سمیر پور' ٹھاکروں کا گاؤں تھا، لیکن گاؤں کے ایک کونے پر کچھ نچلی ذاتوں کے لوگ رہتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس اپنی زمینیں نہیں تھیں۔ اس لیے ٹھاکروں کے کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے۔

اگر پہاڑ کے نظریے سے دیکھیں تو سمیر پور ایک بڑا گاؤں تھا۔ چالیس پچاس خاندان ٹھاکروں کے اور دس پندرہ خاندان نچلی ذاتوں کے رہتے تھے۔ کل ملا کر گاؤں میں چہل پہل رہتی تھی، لیکن پچھلے کچھ سالوں سے جو ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے پورے گاؤں کو سونا کر دیا۔ اچھے پیسوں والے کے بچے، جو ایک بار پڑھائی کے بہانے سے شہر گئے تو پھر گاؤں نہیں لوٹے۔ بوڑھے ماں باپ جب کمزور ہو گئے تو وہ بھی بچوں کے پاس ہی چلے گئے۔ اب وہ لوگ صرف چھٹیوں میں پکنک کے طور پر ہی یا بیچ بیچ میں بٹائی پر دیے اپنے کھیتوں کا حساب کرنے کے لیے گاؤں آتے تھے۔

نچلی ذاتوں میں بھی جن کے بچے پڑھنے میں اچھے تھے وہ اپنی محنت اور حکومت کی مدد سے نوکری تو پا ہی گئے تھے۔ بس کچھ ایک خاندان ہی ایسے تھے جنہیں غربت کے سبب پڑھنے کا موقع بھی نہیں مل پایا تو نوکری کیا خاک کرتے۔ جن کے بچوں کی نوکری لگ گئی تھی ان کا خرچ بچوں کے بھیجے گئے منی آرڈر سے ہی چل جاتا۔ اس لیے انہوں نے بھی مزدوری کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب غریبوں کے پاس زمینیں نہیں تھیں اور ان کے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چل پاتا تھا، لیکن اب تو صورت حال یہ تھی کہ کھیت زیادہ تھے اور مزدور کم۔

Mob: 9032815440 Email: nehalmd6788@gmail.com

جن گھروں کے بڑے بوڑھے انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بچوں کو تو گاؤں آنے کی فرصت تک نہیں تھی۔ کھیت بنجر پڑے ہوں اس سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن جو بڑے بوڑھے زندہ تھے ان کو اپنے کھیتوں سے بہت لگاؤ تھا۔ بھلے ہی وہاں سے کچھ نہ ملے، لیکن کھیت بنجر نہ ہوں یہی ان کی خواہش رہتی تھی۔ ایسے ہی کچھ کھیتوں کو کنتی نے بٹائی پر لے لیا تھا۔

کتنا سمجھایا تھا منگسیر و کو، مت جا گاؤں چھوڑ کر یہاں اناج اگانے کے لیے بہت کھیت ہیں۔ دونوں محنت کرتے تو خوب اناج پیدا ہوتا۔ خود کے لیے تو پورا ہوتا ہی کچھ بیچ بھی لیتے۔ کنتی نے سنا تھا کہ اب تو پہاڑ کی فالتو چیزیں بھی شہروں میں بکنے لگی ہیں۔ بلاک کی سطح پر کئی تنظیمیں بن گئی تھیں جو سامان کو خرید لیتی تھیں۔

کنتی کی شادی ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اس درمیان بہت کچھ بدل گیا تھا۔ خود بھی وہ دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ سسر کا انتقال ہو گیا تھا۔ منجھلے دیور کی شادی ہو گئی تھی۔ دیورانی اتنی جھگڑالو تھی کہ دو دن بھی کنتی کے ساتھ گزارا نہیں پائی۔ ہار کر کنتی کو ایک ہی گھر میں دو چولہے کرنے پڑے۔ چھوٹا دیور گھر سے شہر بھاگ گیا۔ اب وہیں کسی ہوٹل میں کام کر رہا تھا۔ کبھی گھر کی یاد آتی تو چلا آتا تھا۔ آج کل وہ اپنا ایک چھوٹا سا ڈھابا کھولنے کی تیاری میں ہے اور کنتی اس کا گھر بسانے کی۔ پچیس سال کا ہونے والا ہے اور ابھی تک اس کا گھر نہیں بسا ہے۔ یہی فکر کنتی کو کھائے جا رہی تھی۔ منگسیر و یہاں ہوتا تو اس سے اس کو کتنی مدد ملتی۔

منگسیر و پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ گاؤں میں تھا تو اس کی جتنی آمدنی ہو جاتی اس سے خوش رہتا۔ دونوں محنت کر کے گزارا کرنے بھر کما لیتے تھے۔ دونوں ہی بہت محنتی تھے۔ اس لیے خوب سارے کھیت بٹائی پر لے لیتے اور اب تو بٹائی کیا پوری فصل کے مالک وہی ہوتے تھے، لیکن برا ہو اس کندن کا، نہ جانے کیا کیا سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ دلی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کندن خود ایک حویلی میں چوکی داری کرتا تھا۔ مالک جب فوج میں تھا تو بڑے شوق سے اس نے یہ حویلی بنوائی تھی۔ دو بچے ہیں۔ دونوں ہی بیرون ملک میں رہ رہے ہیں۔ دو سال پہلے کرنل صاحب بھگوان کو پیارے ہو گئے تو ان کی بیوی بھی بیٹے کے پاس امریکہ چلی گئی اور اب کندن اسی حویلی کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایسی ہی کئی حویلیاں تھیں جن میں چوکی داروں کی ضرورت تھی۔

کندن نے منگسیر و کو بھی بڑے بڑے خواب دکھائے تھے۔

”ارے یار یہاں کر کیا رہا ہے تو؟ چل میرے ساتھ، میں تجھے کام دلاؤں گا۔ ارے وہاں جا کر تجھے پتہ چلے گا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ بتاتے ہوئے کندن کی آنکھیں چمک اٹھتیں تو منگسیر و کی آنکھوں میں بھی کندن کے دکھائے خواب چمک اٹھتے۔

کچھ دنوں تک ہاں نا کے بیچ جھولتا منگسیر و آخر کار کندن کے ساتھ دلی آ ہی گیا اور کنتی دو بچوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ کہنے کو تو دیور دیورانی اسی گھر میں رہتے تھے، لیکن ان کا ذرا بھی سہارا نہیں تھا۔ کنتی بالکل بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر انہیں اکیلا چھوڑ کر شہر چلا جائے۔ اس بار اسے شہر گئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ بڑا بیٹا 'چنو' تب چار سال کا تھا اور چھوٹی بیٹی 'منیا' ڈھائی سال کی تھی۔

پہلی بار دلی جانے کے دو مہینے بعد ہی منگسیر و گاؤں لوٹا تھا تو خوشی کے مارے وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔

”میں نے وہاں سب کو اپنا نام منگل سنگھ بتایا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرا نام منگسیر و رکھ دیا گیا تھا؟ آتے ہی اس نے کنتی کے سامنے ایک دھماکہ کیا۔

”کیوں؟ اس نام میں کیا برائی ہے؟“

”ارے کتنا پرانا سا نام لگتا ہے منگسیر و، ایسے لگتا ہے جیسے کسی مہینے کا نام بول رہے ہوں۔“

منگسیر و ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ پہلے ایسا ہی تو ہوتا تھا۔ جو بچہ جس مہینے میں پیدا ہوتا اس کا نام اسی مہینے کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا۔ مارگ شیرش* کے مہینے میں پیدا ہونے کے سبب ہی اس کا نام منگسیر و رکھا گیا تھا۔

جس حویلی میں منگسیر و کو نوکری ملی تھی، اس کے مالک کا کئی شہروں میں خود کا کاروبار تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں شادی شدہ بیٹیاں امریکہ میں رہ رہی تھیں۔ مالک خود بھی کام کے سلسلے میں زیادہ تر دلی سے باہر ہی رہتا تھا۔

”جلدی جلدی گھر نہیں آ پاؤں گا میں۔ ابھی نئی نئی نوکری ہے۔ کچھ دن ہو جائیں، تھوڑا آمدنی کا اندازہ لگ جائے تو تم لوگوں کو بھی وہیں لے جاؤں گا۔ انگریزی اسکول میں پڑھیں گے میرے چنو اور منیا۔“

”کیوں؟ ابھی تنخواہ کتنی ملے گی یہ نہیں بتایا کیا مالک نے؟“

کنتی کو منگسیر و کی ہر بات عجیب لگ رہی تھی۔

”ارے تنخواہ سے کیا ہوتا ہے؟ کندن کہہ رہا تھا کہ وہاں اس سے اور زیادہ کمائی ہو جاتی ہے۔“

”اور کمائی؟“

”تو نہیں سمجھے گی۔ جب تیرے لیے ڈھیر سارا سامان گھر لاؤں گا تب تیرے سمجھ میں آئے گا۔“ منگسیر و کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اس کے بعد منگسیر و چھ ماہ بعد آیا تھا۔ ہاں اس درمیان اس کا ایک خط اور دو ہزار روپے کا منی آرڈر ضرور آیا تھا۔ ڈاکیہ نے جب پہلی بار اس کے ہاتھ میں دو ہزار روپے رکھے تھے تو وہ خوشی کے مارے پاگل ہو گئی تھی۔ کہاں رکھے اتنے پیسے اور کیا کرے؟ اسے تو انہیں گننا بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے پیسے روپے تو نہیں پر اناج خوب دیکھا تھا۔ اسی اناج کے بدلے اپنے لیے سب کچھ خرید لیتی تھی۔

چھ مہینے بعد منگسیر و آیا تو بالکل ہی بدلا ہوا انسان تھا۔ پینٹ ، قمیض، آنکھوں پر کالا چشمہ، پیروں میں مہنگے جوتے، اس کی تو ہر ادا ہی نرالی تھی۔ اور اس کے سامنے کنتی میلی کچیلی دھوتی پہنے چولہا پھونک رہی تھی۔

”ایسے کیسے رہتی ہے تو؟ ذرا ڈھنگ سے رہا کر۔ اچھے کپڑے پہن، کریم پاؤڈر لگا۔ شہروں میں دیکھ کیسے ٹیپ ٹاپ بن کر رہتی ہیں لڑکیاں۔“ کہتے ہوئے منگسیر و نے اپنے بیگ سے ایک اچھی سی ساڑی اور کچھ

میک اپ کا سامان نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو تم؟'' اچھی ساڑی پہن کر، کریم پاؤڈر لگا کر کیا کھیت میں کام کرنے جاؤں گی میں!'' کنتی نے ساڑی اور دوسرے سامان سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تو کون کہتا ہے کہ تو کھیتوں میں کام کر؟ میں کماؤں گا تو ٹھاٹ سے کھایا کر۔ اور پھر کچھ ہی وقت کی تو بات ہے۔ تو بھی چلنا میرے ساتھ شہر۔''

''شہر تو جب چلوں گی تب چلوں گی۔ ابھی تو گھر میں جو کام ہے اسے تو کرنا ہی ہے۔ اپنی جڑیں اتنی جلدی نہیں چھوڑنی چاہیے۔'' کنتی کی آواز میں کڑھن صاف طور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اپنا شوہر انجانا اور بیگانہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے بعد تو منگسیرو جتنی بار بھی آیا کنتی کے تئیں اس کی بے گانگی بڑھتی گئی۔ منگسیرو کے سر پر تو صاحب کے گھر میں وقت وقت پر ہونے والی پارٹیاں سوار رہتیں۔ پارٹی میں آنے جانے والے مہمان، اس میں بننے والے پکوان اور ساتھ میں ودیشی مہنگی شراب۔

''کنتی تو وہاں ہوتی تو دیکھتی کہ کیسے کیسے کپڑے پہنتی ہیں آج کل کی لڑکیاں اور کتنا پیسہ ہے لوگوں کے پاس۔ عیش کرتے ہیں لوگ عیش۔''

رات کے گھپ اندھیرے میں بھی کنتی شوہر کی آنکھوں میں چمک دیکھ رہی تھی۔

''تو وہاں ہوتی تو دیکھتی۔'' یہ جملہ تو منگسیرو کی زبان سے کئی بار نکل جاتا،لیکن پہلے کے مقابلے ''تجھے بھی وہاں لے چلوں گا۔'' کے بول نہ پھوٹتے۔ اس کی آنکھوں کی چمک کے آگے بچوں کو انگریزی اسکول میں پڑھانے کی خواہش بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہاں لیکن جب بھی وہ گھر آتا تو بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے کھلونے ضرور لاتا۔ بچوں کو وہ بے حد پیار کرتا۔ بچے بھی منگسیرو کے ایک بار جانے کے بعد اس کے واپس آنے کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔

''بھابھی، کہاں ہو تم؟ غضب ہو گیا۔ میں تو کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔'' دیور بسیسر گھبرایا اور پسینے میں نہایا ہوا کنتی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ کنتی کا دل دھک سا ہو گیا۔ بیوی کے ذریعے کیے جانے والے ظلم کے ڈر سے بسیسر کنتی سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ تین سال ہو گئے تھے بھائی کو گئے ،لیکن بسیسر نے کبھی بھابھی سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسے کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ پھر آج ایسا کیا ہو گیا کہ یہ یوں گھبرایا ہوا اسے تلاش کر رہا ہے۔

''کیا ہو گیا دیور جی؟ کیوں پسینہ پسینہ ہو رہے ہو؟''

''بھابھی میں پڑوس کے گاؤں گیا تھا۔''

''تو؟''

اور اس کے بعد بسیسر نے جو بتایا اسے سن کر کنتی کے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔

اس گاؤں میں بجلی تھی۔ بجلی تھی تو کچھ پیسے والے لوگوں نے ٹیلی ویژن بھی خرید لیا تھا۔ اسی میں کسی نے منگسیرو کو دیکھا تھا۔ اسے پولیس والے پکڑ کر لے جا رہے تھے،لیکن نام منگل سنگھ بتا رہے تھے۔ شکل تو ہو بہو منگسیرو جیسی ہی تھی۔

''کتنا پرانا نام ہے منگسیرو؟ ایسا لگتا ہے کسی مہینے کا نام لے رہے ہوں۔ میں نے تو اپنا نام منگل سنگھ رکھ لیا ہے۔'' کنتی کے کانوں میں شوہر کے کہے ہوئے یہ لفظ گونجنے لگے۔

''لیکن اس نے کیا کیا ہے؟ پولیس والے اسے کیوں پکڑ کر لے جا رہے تھے؟'' کنتی بوکھلائی ہوئی بولی۔

''زیادہ تو نہیں پتہ لیکن کسی کے خون وون کا معاملہ لگتا ہے۔'' بسیسر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''خون! منگسیرو جیسا آدمی کسی کا خون کیسے کر سکتا ہے؟ ضرور انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

کنتی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''میں کیا بتاؤں بھابھی ، میں نے تو ٹی وی دیکھا نہیں، جو لوگوں نے کہا وہ سن لیا اور آپ کو بتا دیا۔''

اپنے آپ کو کسی طرح سنبھالتی ہوئی کنتی گھر واپس لوٹ آئی۔ اس کے دل کو بہت ہی فکر لاحق ہو رہی تھی۔

ایک بار من کہتا کہ بسیسر نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ ہے۔ دوسری بار من کہتا کہ آخر آس پاس کے گاؤں کے لوگ اسے پہچاننے میں بھول کیوں کریں گے؟

اور اگلے کچھ دنوں میں جو ہوا وہ کنتی کے لیے کسی برے خواب سے کم نہیں تھا۔ کچھ ہی دنوں میں منگسیرو کے پکڑے جانے کی خبر پورے علاقے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

منگسیروا اور اس کا مالک ایک سنگین جرم میں پکڑے گئے تھے۔ جرم بھی ایسا کہ سنو تو نفرت سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان پر کم عمر کی لڑکیوں کو جنسی زیادتی کے بعد مار ڈالنے کا الزام تھا۔

دراصل جس حویلی میں منگسیرو کام کرتا تھا اس سے تھوڑی ہی دور پر ایک جھگیوں والی بستی تھی۔ بستی کے بچے پڑھنے لکھنے نہیں جاتے تھے۔ یوں ہی اِدھر اُدھر گھوما کرتے تھے۔ بہت کیا تو کوڑا بننے کا کام کر لیتے تھے۔ اس بستی کی لڑکیاں ایک ایک کر کے غائب ہو رہی تھیں۔

ان جھگیوں کے باشندوں نے جب شروع میں اپنی لڑکیوں کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانی چاہی تو ان غریبوں کی کسی نے نہ سنی بلکہ الٹا ڈانٹ کر بھگا دیا گیا۔ ایک آدھ لوگوں نے دبی دبی آواز میں بڑی حویلی کے مالک کی طرف اشارہ کیا تو ان پر پولیس والوں کا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔ آخر کیسے برداشت کرتے بڑی حویلی والے کے خلاف یہ بے ہودہ الزام۔ وہی بڑی حویلی والا، بڑے دل والا کئی بار اپنے یہاں دعوتیں کرتا، جس میں شہر کے عزت دار اور اعلیٰ عہدوں والے لوگ جمع ہوتے۔ بڑی حویلی والے کی مہمان نوازی اور ان کی پہنچ دونوں ہی معاملے میں بہت مشہور تھے۔ پولیس والوں نے بھی کئی بار ان کا نمک کھایا تھا اور اس نمک کا قرض ادا کرنا ان کا فرض تھا۔

لیکن پاپ کا گھڑا تو ایک دن پھوٹنا ہی تھا، سو پھوٹا۔ بغل کے کسی نالے میں کئی بچوں کی ہڈیاں ملیں۔ ان میں کچھ جوان لڑکیاں بھی تھیں، جو وقت وقت پر بڑی حویلی والے کے یہاں مہمانوں کا دل بہلانے آتی رہتی تھیں۔

مالک اور نوکر دونوں پکڑے گئے، لیکن سارا ٹھیکرا نوکر کے سر پھوٹا۔ مالک نے صاف کہہ دیا کہ اس کی حویلی میں اس کی غیر موجودگی میں کیا ہو رہا تھا وہ نہیں جانتا۔ پولیس والوں نے بھی اسی کا ساتھ دیا۔

گاؤں میں بھی پولیس آئی۔ کنتی سے پوچھ تاچھ کی۔ منگسیرو کے ماضی کے بارے میں پوچھا، لیکن کچھ ہوتا تو لوگ بتاتے۔ کھیتوں میں مزدوری کرنے والا منگسیرو کب شہر جا کر منگل سنگھ بن بیٹھا تھا، گاؤں والوں کو تو اس کا پتہ بھی نہیں تھا۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتے صاحب! وہ تو اپنے بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ تو پھر دوسروں کے بچوں کے ساتھ ایسا کیوں کریں گے۔'' کنتی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

لیکن جب سب کچھ منگسیرو کے خلاف تھا تو ایسے میں اس کی کون سنتا۔ پولیس آئی اور چلی گئی۔ منگسیرو اور اس کے مالک پر جنسی زیادتی اور قتل کا مقدمہ چلا۔ مالک ایک ایک کر کے سارے الزامات سے بری ہو گیا۔

تب سے دو سال گزر ہو چکے ہیں۔ کنتی اور اس کے بچے گاؤں والوں کے لیے اچھوت ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے کھیتوں کو کنتی نے بٹائی پر لیا تھا ان لوگوں نے بھی اس سے کھیت واپس لے لیا۔ اب کوئی اسے مزدوری پر بھی نہیں رکھتا تھا، جیسے کہ وہی مجرم ہو۔

کنتی نے بڑے بیٹے کو اسکول میں داخلہ دلا دیا تھا۔ اب اسے بھی وہاں سے نکال دیا گیا۔ چنو کو اسکول میں بچے بھی طعنے دیتے تھے اور ماسٹر بھی۔ کلاس میں اسے الگ بیٹھایا جاتا تھا۔ گھر آ کر چنو روتا اور ماں سے کئی سوال کرتا۔

''میرے باپ نے کیا بچوں کو مار کر کھایا ہے ماں؟ اسکول میں آج آشیش کہہ رہا تھا۔''

ماں کا سینہ چھلنی ہو اٹھتا۔ بچے کا ننھا سا دل یہ الزامات کیسے برداشت کرے گا۔ اب تو منگسیرو کے ساتھ وہ الزام بھی جڑنے لگے تھے جو اس نے کیے ہی نہیں تھے۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ ہار کر اس نے چنو کو اسکول سے نکال لیا۔ یہاں اب پیٹ بھرنے کے لالے پڑ گئے تھے تو بچوں کو کہاں سے پڑھاتی۔

منگسیرو کو اس نے پچھلے دو سالوں سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ چاہتی تھی کہ اس کو دیکھے، اس سے ملے اور پوچھے کہ کیا اس نے ایسا کیا بھی ہے یا اپنے مالک کے برے کاموں کی سزا بھگت رہا ہے۔ بس ایک بار وہ منگسیرو سے یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ کنتی سے ''نا'' کہہ دے تو وہ اسے معاف کر دے گی۔ عدالت اسے کوئی بھی سزا دے، لیکن بھگوان کے دربار میں وہ اپنے شوہر کے لیے معافی کی درخواست کرے گی، لیکن پہلے ایک بار وہ اس سے مل تو پائے۔ سنا تھا منگسیرو دلی کی سب سے بڑی جیل میں بند تھا۔

اس نے گاؤں میں کئی لوگوں سے گزارش کی کہ ایک بار کوئی اسے دلی لے چلے۔ اس نے اپنے دیور کی بھی منت کی تھی، لیکن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ چھوٹا دیور تو اس واقعے کے بعد سے گاؤں ہی نہیں آیا۔

کنتی کے سامنے اب بچوں کے پیٹ پالنے کا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جب گھر میں رکھا اناج ختم ہونے لگا تو اس نے گاؤں کے مکھیا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ میرے شوہر نے جو کیا اس کی سزا میرے بچوں کو کیوں؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

مکھیا پسیج گیا۔ کنتی کو سرکاری اسکیم کے تحت کچھ دنوں کے لیے مزدوری کا کام دلوا دیا۔ کنتی نے راحت کی سانس لی۔

اور تبھی یہ منحوس خبر آئی کہ عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مالک کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا گیا اور منگسیرو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

دو دن بعد کنتی کو اس کی خبر ملی۔ کچھ دنوں بعد پھانسی کا وقت مقرر ہوا۔ کنتی کی بے چینی بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ شوہر سے ملنے کی خواہش اور قوی ہو گئی، لیکن کیسے ملے؟

کنتی اور اس کے بچے اب گھر کے باہر بھی نہیں نکلنا چاہتے تھے۔ جہاں جاتے ایک ہی بات، کنتی کو لگتا تھا جیسے یہ گناہ اس کے شوہر نے نہیں بلکہ خود اس نے کیا ہے۔

منگسیرو نے اگر ظلم کیا تھا تو اسے سزا ملی، لیکن بے گناہ کنتی کو کس بات کی سزا مل رہی تھی۔ یہ سوچنے سمجھنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا اور کنتی تھی کہ تل تل مرنے کی سزا کاٹ رہی تھی۔ ●●

*ہندی کیلنڈر کا نواں مہینہ، جسے عام طور پر 'اگہن' کہا جاتا ہے۔

کتابی سلسلہ

اردو جرنل

مدیر

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (بہار)

غزلیں

ڈاکٹر فریاد آزر

اگر مجبوریوں میں ہم سرِ بازار ناچیں گے
ہمارے ساتھ پھر سارے درو دیوار ناچیں گے

مقدر میں سبھی کے ناچنا لکھّا ہے قدرت نے
زمیں پر بچ گئے جو، آسماں کے پار ناچیں گے

مصنف رقص لکھتا ہے مرے حصہ میں تو سن لے
میں ناچا تو کہانی کے سبھی کردار ناچیں گے

ٹکے گی دشمنوں کی فوج کب تک ایسی دھرتی پر
خوشی میں دیکھنا پھر کابل وقندھار ناچیں گے

نچایا ہے سدا درباریوں کو اپنی انگلی پر
سو اب ظلّ الٰہی خود سرِ دربار ناچیں گے

ہمیشہ سر برہنہ لوگ ہی رقصاں رہیں گے کیا
وہ دن کب آئیں گے جب جبّہ و دستار ناچیں گے؟

اسے تنہا نچانے کا ارادہ کچھ نہیں میرا
وہ ناچے گا تو اس کے حاشیہ بردار ناچیں گے

نچانے کا ارادہ دشمنوں کا ہے تو یہ سن لیں
جو میں اک بار بھی ناچا تو وہ سو بار ناچیں گے

غریبوں کے مقدر میں تو اکثر ناچنا ٹھہرا
سنا ہے آج اس بستی کے عزّت دار ناچیں گے

یقیناً مندر و مسجد میں اک دن دوستی ہوگی
گلے مل مل کے باہم سبحہ و زنّار ناچیں گے

ملالوں ہاتھ میں بھی بے ضمیری سے اگر آزرؔ
مرے قدموں میں بھی پھر درہم و دینار ناچیں گے

لو پھر نظارہء حسن و جمال کر رہے ہیں
ہم آج دل کی حکومت بحال کر رہے ہیں

وہ صرف ایک نظر ڈال کر چلا بھی گیا
ہم اس کے بارے میں کیا کیا خیال کر رہے ہیں

تمھارا حسن ، تمھارا خیال رکھ دل میں
ہم اپنے آپ کو اب مالا مال کر رہے ہیں
دماغ درد کی شدت سے پھٹ نہ جائے کہیں
ازل سے کتنے مسائل دھمال کر رہے ہیں

یہ کس مزاج کی آلودگی ہے مرکز میں
کہ دائرے مرا جینا محال کر رہے ہیں

یہ اقتدار کا لالچ کہاں تک آپہنچا
دل و دماغ بھی جنگ و جدال کر رہے ہیں

ادب ، ثقافت و تاریخ یا ریاضی ہو
ہمارے عہد کے بچے کمال کر رہے ہیں

جنوں کو جامہء اشعار دے کے ہم آزرؔ
ترا فسانہء غم لازوال کر رہے ہیں

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ

تفہیمات وترجیحات

فرسودہ موضوعات، کہنہ لفظیات اور بوجھل ثقیل اصطلاحات کی وجہ سے تنقید ایک کلیشے میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ تکرار اور یکسانیت نے شاید قارئین کو تنقیدی تحریروں سے بیزار کر دیا ہے۔ ایسے میں نئے موضوعات اور نئے زاویوں کی جستجو یقیناً ایک دشوار عمل ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ ''تفہیمات وترجیحات'' کا اختصاص یہ ہے کہ اس سے تنقیدی تجسس، تازگی، تنوع اور بین علومی مطالعات کی ایک اچھی صورت سامنے آتی ہے۔ اس میں مختلف ادبی تصورات، تنقیدی میلانات اور رجحانات کے حوالے سے تحریریں شامل ہیں۔ اساطیر، جمالیات اور اسالیب کے علاوہ ان موضوعات کو بھی محور بنایا گیا جو عصر حاضر میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تفہیمات وترجیحات' میں شامل تحریروں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ ارتکاز، انہماک اور مراقباتی کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اعلیٰ تنقیدی بصیرت کا عکس بھی ہے اور مطالعاتی وسعت بھی۔ تفہیم وتجزیے میں بھی منطقی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے فکر و نظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور تفہیم وتعبیر کے در وا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اپنی ذہنی ساخت اور علمی بصیرت کے اعتبار سے ادبی دنیا میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ بر صغیر کے مقتدر رسائل وجرائد میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اساطیر اور جمالیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ معاصر ادبی تحریکات ورجحانات سے بھی باخبر ہیں۔ عالمی ادبیات سے بھی ان کی گہری شناسائی ہے۔ 'ادب، اسطور اور آفاق'، 'اردو غزل کا عبوری دور'، 'ادب اور جمالیات'، 'مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس'، 'فن تضمین نگار' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ دہلی یونیورسٹی سے فیض یافتہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کو مقتدر اداروں اور اکادمیوں کی طرف سے اعلیٰ اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ستیہ وتی کالج دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ان کی وابستگی ہے۔ اس وقت اردو قومی کونسل کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس کتاب کی قیمت 130 روپئے ہیں۔

اگر آپ اس کتاب کی پرنٹڈ کاپی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو رابطہ کریں:

Sale-cum-Exhibition Centre
West Block - 8, Wing - 7, R. K. Puram, New Delhi - 110066.
Telephone : (+91 - 11) 26109746, 26108159
Fax : (+91 - 11) 26108159
email: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شام تنہائی

ڈاکٹرنسرین بیگم (علیگ)

دنیا ایک طرف عیش و عشرت کا گہوارہ ہے تو دوسری طرف مصائب و آلام کا دلفریب مرقع۔ انسان کبھی خوش ہے تو کبھی غمگین و دردمند، کبھی قابل رشک ہے اور کبھی اشک میں مبتلا۔ آج کچھ ہے تو کل کچھ، کون جانتا ہے کہ اس دنیا کے وسیع سمندر کے مدوجزر میں کس ساحل پر پناہ لیں گے۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

رابعہ کی زندگی اسی سمندر کے مدوجزر میں ہچکولے کھا رہی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ زندگی تو انہیں دشواریوں کا نام ہے اور رابعہ ان دشواریوں میں بری طرح گھری ہوئی ہے۔ والدین نے بڑے ارمان سے رابعہ کی شادی کی تھی۔ چونکہ وہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی ماں باپ نے بڑے نازونعم کے ساتھ اس کی پرورش کی اور کبھی بھی رابعہ کے چہرے پر شکن نہ آنے دیا۔ رابعہ جب رخصت ہوئی تو جیسے اس کے سسرال چلے جانے سے گھر کی رونق ہی چلی گئی، والدین اداس رہنے لگے، مگر یہ سوچ کر دل کو بہلا لیا کہ لڑکی تو پرائی ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہم سے جدا ہونا ہی تھا۔

رابعہ کچھ دنوں کے لیے اپنے مائیکے آئی، مگر اکیلی، ساتھ میں اسلم نہیں آیا۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا، مگر رابعہ ہر ایک سے یہی کہتی کہ وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ اس وجہ سے وہ نہ آسکے۔ کچھ دنوں بعد رابعہ پھر سسرال چلی گئی۔ وہاں بھی اسلم کا یہی حال تھا کہ رابعہ کے لیے بالکل اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ رابطہ کی طبیعت بھی خراب ہوتی تو اس کو فرصت نہیں کہ وہ اس سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھے۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ رابعہ کے پاس ایک بیٹا تھا۔ وہ بھی والد کی محبت سے محروم ہے۔

گردش یہ کہ نازونعم کی گود میں پلی رابعہ آج مجبور و محبوس غم ہے۔ بے نوا اور ماندۂ ماتم ہے، کچھ دنوں کے لیے رابعہ اپنے مائیکے چلی گئی۔ مگر کافی روز ہو جانے پر بھی اس کے سسرال کے کسی فرد نے اس کی خبر نہ لی۔ معلوم یہ ہوا کہ اسلم نے دوسری شادی کر لی ہے اور اب تو رابعہ کو یہاں واپس آنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آخر اسلم نے ایسا کویں کیا؟ بہت سوال کرنے پر اسلم بولا کہ یہ شادی میری مرضی سے نہیں بلکہ زبردستی کی گئی تھی۔ وہ بھی میری پسند کے خلاف۔ رابعہ کے والد غصے سے کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان تھا۔

اسلم! تم نے بڑی آسانی سے کہہ دیا کہ میری پسند رابعہ نہیں تھی کوئی اور تھی اور پھر تم نے دوسری شادی کر لی۔ کیا تم نے رابعہ کی زندگی کے بارے میں کبھی سوچا اور اس معصوم بچے نے کیا گاہ کیا تھا۔ جس کی سزا وہ پوری زندگی بھگتتا رہیے گا اسلم خاموش تھا۔ مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں جو کرنا تھا، وہ ہم نے کر لیا۔ اب کیا فرق پڑتا ہے مگر رابعہ کا ماضی دل میں موہوم ارمانوں کی ایک دنیا بسا کر مستقبل کا زریں خواب بن چکا تھا۔ خود اس کے لیے انتہائی خلش افزا اور تکلیف دہ ہے۔ رابعہ کا بچپن ہزار ہا لطافتوں کا گنجینہ تھا اور جوانی کا یہ درد جس میں ہر ادنیٰ ٹھیس دل کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ شباب کی امنگوں کے ساتھ ساتھ حسرت و یاس کا مجموعۂ غم و اندوہ کا مرقع اور تفکرات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ رابعہ کا بیٹا احمد اب سمجھدار ہو گیا تھا مگر والد کی محبت سے محروم تھا۔ اس کی نظر کے سامنے ماں کا اداس چہرہ رہتا، کبھی وہ سوال کرتا کہ اماں آپ اتنی اداس کیوں رہتی ہیں؟ مگر احمر کو اپنی ماں کی اداسی کی وجہ تو معلوم ہی نہیں تھی۔ اسلم کے پاس بے شمار دولت تھی۔ وہ احمر کے خرچ کے لیے کبھی کبھی روپئے بھیج دیتا تھا، مگر یہ روپئے رابعہ کی اداسی کو ختم نہیں کر سکتے تھے۔ وقت گزرتا چلا گیا اور کتنی ہی بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔ گھٹائیں کتنی ہی بار آئین اور چلی گئیں، گھٹائیں کتنی ہی بار آئیں اور اس کے حال زار پر روئیں مگر رابعہ کے آنسو کبھی آنکھوں سے خشک نہیں ہوئے۔ رابعہ کے سوگوارانہ حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ مگر رابعہ کی شگفتگی کم ہوتی چلی گئی۔ اس کی تازگی، افسردگی میں بدلتی چلی گئی۔ احمر بڑا ہو چکا تھا۔ اب رابعہ کے سامنے اس کا مستقبل تھا۔ مگر وہ تنہا کیا کر سکتی تھی۔ اپنی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے اس نے سلائی، کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو کام میں لگائے رکھتی۔ جو چیزیں بناتی اسے فروخت کر دیتی تھی تاکہ احمر کا مستقبل سنور سکے۔ اس کو اچھی تعلیم دلا سکے۔ احمر بار بار اس سے سوال کرتا کہ آخر ہمارے پاپا ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ مگر رابعہ یہی کہتی کہ بیٹا ان کے ساتھ کچھ مجبوری ہے۔ انسان کو ہر حال میں صبر و شکر سے کام لینا چاہیے۔ آدمی مقدر سے مجبور ہے۔ مگر جہاں تک ہو سکے گا گردش قسمت سے لڑوں گی اور اپنے موجودہ حالت کو بدلنے کی سعی اور مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کروں گی۔ رابعہ ہر بار احمر کے سوال کا جواب اسی طرح دیتی مگر رابعہ کو یہ معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی کشتی یونہی بوجھل اور اداس سی چلتی رہے گی۔ کیونکہ ساحل تک آکر وہ ساحل سے دور ہو گئی تھی اور اب اسے کبھی بھی کنارا نہیں ملے گا۔ احمر کے بار بار سوال کرنے پر بھی وہ اس کا معقول جواب نہ دے پائی تھی۔ آخر اس کی کیا خطا تھی۔ اسے فکر تھی تو یہ کہ میں اپنے سوال کا جواب مانگوں گی کہ کیا صرف مرد کو ہی فیصلے لینے کا اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جب تک چاہے اسے رکھے اور پھر نکال کر پھینک دے۔ لڑکی کوئی سامان تو نہیں کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو۔ نہیں اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ دنیا کو یہ بتاؤں گی کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوگئی ہے، دھوکا ہوا ہے، کوئی ہے جو انصاف دلا سکے گا۔ اس کا کھویا ہوا مقام اسے حاصل ہو سکے۔ کیا کوئی ایسا قانون ہے کہ جو کھویا ہوا حق اس کو دلا سکے۔ ٹوٹے ہوئے محل کو پھر سے بنا سکے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ رشتہ محبت سے مضبوط ہوتا ہے قانون سے نہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ چپ ہو گئی۔ جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں کہ بس اب تو شام تنہائی ہے اور کوئی نہیں۔ ●●

تخلیقات

جناب بلراج بخشی

اور

ڈاکٹر اجے مالوی

کی مشترکہ ادارت میں شائع ہونے والا معیاری رسالنامہ.

takhliqat@gmail.com

9419339303

9451762890

ادبی و تہذیبی رپورتاژ

ڈاکٹر محمد ناظم علی

ارضیات غالب

۱۰۰ غزلوں پر مشتمل سہ لسانی مجموعہ

سہیل کاکوروی

ناشر: گولا گنج، لکھنؤ

پرچھائیاں

(کہانیوں کا مجموعہ)

ارمان شمسی

۱۵۰ روپے

۸۵، خواجہ دیوان فرسٹ لین (لال باغ) پانچوی

منزل، ڈھاکہ۔۱۲۱۱، بنگلہ دیش

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی تازہ پیش کش

یوسف سلیم چشتی (کلام غالب کے شارح)

مصنف: عبدالسمیع

قیمت: سو روپے

''یوسف سلیم چشتی کی تحریریں ادب کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں۔ شاید ہی ادب کا کوئی ایسا طالب علم ہو جس نے ان کی شرح سے استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ (عبدالسمیع) نے فرض کفایہ ادا کیا ہے اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

(شمس بدایونی)

اجمل سلطانپوری

ڈاکٹر زیبا محمود

شاعر وہی ہے جو ذرات کے دلوں کی دھڑکنوں کو سنتا اور سمجھتا ہو۔۔۔شاعر وہی ہے جو شبنم کے قطرات میں بحر بیکراں کی گہرائی اور گیرائی، تہہ و بالا ارتعاش، امواج طوفان جزر و مد دیکھتا ہے۔۔۔شاعر وہی ہے جسے ہر شے میں حسن فطرت کے جلوے نظر آتے ہیں۔اجمل سلطانپوری

بیسویں صدی کے اوائل نے ہندوستان میں فکر و خیال کے بہت سے دھندلے گوشے اجاگر کئے۔شعر و ادب کی دنیا میں بھی نئے نئے رجحانات اور میلانات پیدا ہوئے۔جس میں فکر و فن کے آہنگ کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ اہم تھا۔روایتی تصورات نے فنی التزامات کو بنیادی اہمیت دے رکھی تھی۔غزل کی روایت فکر و خیال کا متعین محور بن چکی تھی۔اس کو بڑی حد تک تہذیبی محور کی حیثیت حاصل تھی لیکن غزل کے فکری اور جذباتی تار و پو میں اب وہ تازگی نہیں تھی۔اسے نئے رنگ و آہنگ کی ضرورت تھی۔ایسی حالت میں شعرا کے لئے فنی تربیت ہی جانِ شاعری بن کر گئی تھی۔دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو نئے فکر و احساس کو سمونے کے لئے فنی تبدیلیوں کو نظر انداز کر دینے کا حامی تھا۔ادب کے اس بحرانی دور میں ریاست اتر پردیش کے مشرقی افق پر سلطانپور سے (۱۹۲۶ء) ایک ایسا ستارہ طلوع ہوا جس نے آگے چل کر اپنی نعتوں، غزلوں اور خوبصورت پابند نظموں سے نہ صرف اپنے قصبے کو پر نور کیا بلکہ اس صوبے کی عظمت کو بھی چار چاند لگائے۔یہ اختر تابندہ کوئی اور نہیں بلکہ مرزا محمد اجمل بیگ اجملؔ سلطانپوری ہے۔ اردو زبان و ادب کا مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا نہ ہی اس سر زمین کو جسے اجمل سلطانپوری کی ''جنم بھومی'' ہونے کا شرف حاصل ہے اجمل نے اس دانش کدے کی ادبی فضا کو اپنی نعتوں، غزلوں اور خوبصورت پابند نظموں سے مزین و سرفراز کیا۔اجمل سلطانپوری کا تعلق اس مکتبہ فکر سے ہے کہ وہ نہ تو نئے اسالیب فکر و خیال سے گریز کرتے ہیں اور نہ فنی رچاؤ سے بے پروا نظر آتے ہیں۔ان کی داخلیت نہ تو ماحول سے بے نیاز رہتی ہے اور نہ ماحول کا احساس داخلیت سے بے نیاز ہونے پاتا ہے۔اجمل سلطانپوری زمانے کے ساتھ چلتے ہیں لیکن مشعل راہ خود ان کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے وہ باغ و بہار شخصیت کے حامل ہیں۔جن کے مزاج کی شگفتگی اور خوش گفتاری موقع و محل کے اعتبار سے لطیف طنز و مزاح کا ہلکا سرور بخشتی ہے۔کبھی کبھی لہجہ کی یہ سرور آفرینی حالات کی بنیاد پر صہبائے تند کی تلخیوں میں بھی بدل جاتی ہے لیکن یہ تلخیاں ناگوار سہی دیر پا نہیں ہوتیں۔احساسات کی مہمیز سے پیدا ہوا یہ عارضی تغیر ایک فطری عمل ہے۔لیکن مجموعی طور پر وہ ایک خوش فکر مفکر ہیں۔ان کی رنگا رنگ شخصیت اپنا ایک مخصوص اور قابل رشک مقام رکھتی ہے۔

اجمل سلطانپوری کی شاعری کے متعلق واقف کاروں کا حلقہ وسیع تر ہے۔شاعری کے مستحکم اور تناور درخت پر تخلیق کے جو گلہائے خوش رنگ کھلے ہیں وہ بنیادی طور پر اسی فکر و فن کا شعری عکس ہیں۔ان کی تخلیقیت نہ تو مبلغانہ ہے اور نہ انتہا پسندانہ، نہ تو فنی میکانیت کا غلو ہے اور نہ خواب و خیال کو مدہوش کر دینے والی رومانیت۔اس کے برعکس ان کے یہاں وہ سادہ ذہن ملتا ہے جو گرد و پیش کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے مختلف تار و پو کا تجزیہ پیش کرتا ہے اور انھی میں سے مناسب اجزا کا انتخاب کرتا ہے۔انھی کی ترکیب سے اپنے تصور کی دنیا تعمیر کرتا ہے جس کی انفرادیت میں عام انسانی احساسات کا زیر و بم ہے۔ان کے یہاں نہ فرار سے گریز ہے نہ سپردگی اور بے بسی، نہ اختلافات کی بے ذوق تبلیغ اور نہ محض نفسیاتی الجھنوں کی تسکین بلکہ اجمل سطانپوری کی دنیائے شاعری کے کردار انسان ہیں جن کی تخلیق احساسات کی متضاد لہروں پر مبنی ہونے کے باوجود ایک ایسے حسن امتزاج پر قائم ہے جن سے جینے کی آرزو ابھرتی ہے۔وہ نا امیدی میں بھی امید اور رجا کی کرنیں تلاش کر لیتے ہیں۔انھیں یقین ہے کہ تیرگی کا دور دائمی نہیں ہے بلکہ یہ اپنی آخری منزل میں ہے اور اب اس کا اختتام ہوا چاہتا ہے:ؔ

جہاں سے دور اب ظلمت کا ڈیرا ہونے والا ہے
اجالا جلد پھیلے گا سویرا ہونے والا ہے
سحر ہو جائے تو جانا ابھی تو رات ہے راہی
ابھی تو رات ہے۔۔۔

سکوت شب کے دریا میں بھی اک طوفان ہوتا ہے
بندھی ہے ناؤ بھی اس پار اور مانجھی بھی سوتا ہے
سفینہ آئے تو جانا ابھی تو رات ہے راہی
ابھی تو رات ہے۔۔۔

اجمل سلطانپوری کی شاعری دل کی آواز بھی ہے اور دماغ کی تندی بھی۔ان کی نظمیں خرمن میں حسن ستم کیش کی بجلیاں ہیں اور عشق وارفتہ مزاج کی

صدر شعبہ اردو، گنپت سہائے پی۔جی۔کالج۔سلطانپور، یوپی

والہانہ شگفتگی بھی۔ جنوں کی پاکدامنی بھی ہے۔ مناظر فطرت کی مصوری بھی ہے اور داخلی جذبات کی عکاس بھی۔ عظمت انسان کی قصیدہ گوئی بھی اور اس کی پستی پر نوحہ گری بھی۔ مذہب کا جوش وخروش بھی ہے اور حب وطن کا بیدار اساسی شعور بھی۔ ماضی کی روایت سے وابستگی بھی اور نظام نو کا سنہرا خواب بھی۔ غرض سب کچھ ہے جو زندہ اور پائندہ ادب کی جان ہے۔

تیری سیماؤں پہ ہم آنچ نہ آنے دیں گے
اپنی جنت کو جہنم نہ بنانے دیں گے
تری مٹی ہے شیدان محبت کا کفن
اے مرے پیارے وطن

مغرب کی سمت سے سوئے مشرق بوقت شام
اک بنت بحر موج طرب میں سبک خرام
ساحل پہ غوطہ خور حسینوں کا اژدہام
سیتائیں ڈبکی مار کے کہتی ہیں رام رام
ٹیلوں پہ کتنے کرشن ہیں ہنسی لئے مگن
کتنے پجاری حسن کے گانے لگے بھجن
یہ نیلی پیلی سرخ سی ہے اجلی بجلیاں
صد رشک لالہ زار یہ جاذب نظر سماں
مغرب میں آسمان کا مطلع شفق نشاں
چھایا ہوا سا آموں کے باغوں پہ وہ دھواں
جڑہن لگا دیا ہے کسانوں نے جھیل میں
لہرا رہے ہیں سبزے قریب ایک میل میں

اجمل سلطانپوری نے اپنی نظموں میں کوئی انوکھی یا چونکا دینے والی بات نہیں کہی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بات کرنے کا سلیقہ کیسا ہے۔ تہذیب حاضر کے نظام بدنہاد او سرمایہ داری کی نگاہ زہرناک کو آتش سیال پی پی کر زبان کے قالب میں ڈھالنا ان کا ہنر ہے۔ جس سے لب ولہجہ میں وقار ہے تمکنت ہے تعمیری جذبہ ہے خلوص ہے ہمدردی ہے اور یہی انداز فکر ایک کامیاب نظم کو آفاقیت کے دوش بدوش کر دیتا ہے اور یہاں شاعر محض کھوکھلی نعرہ بازی سے کام نہیں لیتا۔

مائلِ جنبشِ لب ہند کے مزدور ہوئے
اور یہ کہنے پہ لاچار اور مجبور ہوئے
لڑکھڑا کر نشہ بادۂ آزادی میں
گامزن کون ہوا جادۂ آزادی میں
عزم نو کس کی تھکن کی ہر اک انگڑائی تھی
کس نے منزل پہ پہونچنے کی قسم کھائی تھی
ہند پر حق ہے ہمارا بھی تمہارا ہی نہیں
نقش ہے تیشۂ فرہاد سے نامِ شیریں
یلغار کی آوازِ نو میرے لئے ہے
تلوار کی جھنکار ادا میرے لئے ہے

☆

شمع، خورشید، قمر، برق، شرر، سیارے
ہے ترے ہی رخ انور کی ان سب میں چمک
لعل، یاقوت، شفق، پھول، حنا، انگارے
ہے ترے ہی لب ورخسار کی ان سب میں چمک
وہی اڑتے ہیں ہوئے چھینٹے ہیں یہ جگنو سارے
تیرے ساغر سے ازل ہی میں گئے تھے جو چھلک
بادۂ حسن مرے جام شفق رنگ میں ڈھل

☆

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جس کو تم نے پکارا تھا میں وہی تو نہیں
معاً ہی ذہن میں یہ خیال آتا ہے
کہ میں وہی ہوں مجھے اعتبار بھی تو نہیں
وہ میں نہیں کوئی اور تھا یقیں جانو
وہ اور ہی کوئی صورت تھی شکل پہچانو

''صہبائے غزل'' میں وہ غزل سے یوں مخاطب ہیں:۔

میر، غالب، ظفر وذوق کا انداز کلام
جوش کی نظم مسلسل فکری کے قطعات
داغ کی سادہ زباں نوح کا طوفان خرام
تیرے اوصاف کے پہلو ہیں جگر کے حالات
تو میری جان رباعی ہے میں تیرا خیام
میں ترا حافظ شیراز تو صہبائے غزل

نظم کے باب میں روایت کا فقدان نئے تجربے کے لئے خوش آئند ہے۔ اردو میں جتنے اچھے نظم نگار شعرا ہیں ان کی تخلیقات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو انھیں کے نام سرفہرست آئیں گے، جنھوں نے غزل کے سنگیت پر نظم کا ساز چھیڑا ہے۔ اقبال، جوش، فیض اور بہت سے دوسرے قابل ذکر شعرا نے ہمارے تہذیبی مزاج کا راز سمجھا ہے اور آہنگ وعلامات کے اعتبار سے غزل کے دامن سے وابستگی قائم رکھی ہے۔ اور اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی اجمل سلطانپوری کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اجمل میں بھی غزل کے تہذیبی اثر نمایاں ہے

وہ لب کہاں جو کسی کے لبوں سے مس ہو کر
مشاعروں میں مدھر گیت گنگناتے تھے
وہ نغمگیٔ غزل اب کہاں جسے سن کر
گذرتے وقت کے لمحے سکون پاتے تھے
چل تجھے لے چلوں اس جگہ اے صنم
لوگ جا کر جہاں بھول جاتے ہیں غم
آ مرا ساتھ دے ہاتھ میں ہاتھ دے
ڈگمگا جائیں گے ورنہ میرے قدم

☆

سکون قلب قرار جگر بہار حیات

ترے ہی دم سے ہے شاداب سبزہ زارِ حیات
شریک زیست اگر تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
کہ جیسے پھول میں خوشبو نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہتے ہیں شاعری عروضی مشق کے سہارے بھی کی جاتی ہے اور سیاسی وسماجی مصلحتوں کی بنیادوں پر بھی۔ مگر ایسی تخلیقات دیرپا ثابت نہیں ہوتیں اس کے برعکس اجمل کی شاعری اور ان کی شخصیت دونوں ایک دوسرے کی ترجمان ہیں۔ اخلاقی، صحت مند سماج اور ایسی دنیا کی تعمیر جس میں خلق مروت انسانیت اور مختلف قدریں ہوں۔ اجمل کا شاعرانہ آئیڈیل ایک بہترین دنیا میں ایک بہترین انسان کی تخلیق ہے۔ ان آرزووں اور تمناؤں کا ذکر ہے جو شاعر کے دل میں دائمی غم بن کر رہتی ہیں۔ اجمل سلطانپوری کا ذوق جمالیات محض منتخب موضوعات ہی تک محدود نہیں۔ ان کی کائنات وسیع ہے ان کا جذبہ تحسین کچھ اور بھی گوشے ڈھونڈھ لیتا ہے جن کے آغوش میں تحسین نظر کا کافی سامان ہے لیکن ان کوششوں تک پہنچنے کے بعد یہ داستان اجمل اپنا رخ بدل دیتی ہے۔ انداز بدل جاتا ہے راہ بدل جاتی ہے منزل بدل جاتی ہے اور پھر مرکزی خیال بھی بدل جاتا ہے اور یہی زندہ اور توانا ادب کی پہچان ہے جو جنوں کو بالیدگی بخشتا ہے اور دعوت فکر و عمل بھی دیتا ہے۔ نظم نعرۂ انقلاب میں عہد حاضر کی تصویر کشی کس انداز میں کرتے ہیں۔ ہر بند کے بعد ان کا ٹیپ کا مصرع ''اس دور میں خامی ہے۔ یہ دور بدل دیں گے''، نظم کے تاثر کو پوری طرح سے نہ صرف ابھارتا ہے بلکہ اندھیرے کو اجالے سے بدلنے کی ترغیب اور حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

چنگیز کے ہونٹوں پر جمہور کا نعرہ ہے
سیٹھوں کی زبانوں پر مزدور کا نعرہ ہے
پابندِ رسن لیکن منصور کا نعرہ ہے
اس دور میں خامی ہے
یہ دور بدل دیں گے
یہ قحط زدہ فاقے یہ غربت و ناداری
یہ دور یہ بیکاری یہ بھوک یہ بیماری
آنسو ہے کہ انگارا، شبنم ہے کہ چنگاری
اس دور میں خامی ہے
یہ دور بدل دیں گے

انسان کے احساسات کا عشق کے ساتھ ذاتی اور براہ راست تعلق ہے وہ اس کی کسک کو محسوس کرتا ہے اس لئے ہر انسانی جذبات عشق کے کیف سے سرشار ہو کر شاعر کے احساسات میں مدغم ہو جاتا ہے اور اس کی آرزوئے نفسی کیفیت بن کر شاعر کا میلانِ طبع بن جاتی ہے تو وہ نغمہ پیدا ہوا جو خالصتاً انسانی ہے اور اس طرح اجمل کی عشقیہ شاعری حاسیہ سے ابھر کر ذہن و وجدان کی دنیا پر چھا جاتی ہے الغرض ان کا تصورِ عشق محدود نہیں آفاقی ہے جو ذہن کو فرحت نہیں بلکہ سکون و تشفی کا باعث ہے۔

چراغ ہائے تمنائے دل جلائے ہوئے
تجھی سے تیری محبت کی لو لگائے ہوئے
تخیلات کی دنیا نئی بسائے ہوئے
تصورات کے عالم میں سر جھکائے ہوئے
چراغ صبح کے سر پر ہے مثلِ زلف دھواں
سوادِ شام ہے نورِ سحر پہ بارِ گراں
خیال زلف پہ ابر سیاہ کا ہے گماں
تصور رخ روشن ہے یا مہ تاباں
گذر رہی ہے حسیں شام رات آتی ہے
اب آ بھی جا ترے وعدوں کی بات جاتی ہے

محض عیش کوشی شاعر کا اسلوب نہیں۔ قلب مطمئن کی حاجت نہیں۔ بے کیف تسلسل کا خریدار نہیں اسے تو عزم چاہئے کاہش فرہاد چاہئے دل ناشادگی کی کسک چاہئے، شاعر خطروں میں پڑنے کا عادی اور جہد مسلسل کا مدعی نظر آتا ہے اور جب وہ ان منزلوں سے گذرتا ہے تو اس کی شاعری معجزہ نہیں بلکہ وہ آئینہ ثابت ہوتا ہے جس میں اس کی زندگی کی اہم نکات چھلک جاتے ہیں۔ ان کی بعض نظموں کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت میں مذہب کا ایک نمایاں حصہ رہا ہے ان کی ایک نظم کا عنوان ہی مسلمان ہے۔ جس میں وہ مسلمان کی شناخت اور علامتیں بتاتے ہوئے بالواسطہ ذوق عمل کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ کچھ مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

مسواک اٹھالیتا ہے جب صاحب ایمان
بے تیغ بھی ہو جاتا ہے سر جنگ کا میدان
دلدل پہ بھی تیرائے ہیں مومن نے سفینے
شاہانِ زمانہ کو کیا تابع فرمان
چھاتی پہ سمندر کے بھی رکھ دیتے ہیں گھٹنے
مومن کو کٹورے کا بھی ہوا نہیں نقصان
بن جاتے ہیں طارق تو جلا دیتے ہیں کشتی
زیر قدم آجاتا ہے تاج سر سلطان

یا ایک اور نظم ''آگ لگی ہے'' میں حالات حاضرہ سے مسلماں کو آگاہ کرتے ہوئے اسے خواب غفلت سے بیدار ہونے کی دعوت دیتے ہیں:۔

آہ مساجد اب ویران ہیں
آہ مقابر نوحہ کناں ہیں
علم و عمل سے دور ہیں مسلم
درس گہیں بے نام ونشان ہیں
آگ لگی ہے آگ مسلماں
جاگ مسلماں جاگ مسلماں
تو کہ چراغ مصطفوی ہے
تو کہ گل گلزار علی ہے
پروانہ صدیق و عمر کا
شیدائے عثمان غنی ہے
آگ لگی ہے آگ مسلماں

جاگ مسلماں جاگ مسلماں
تیری اذاں تاثیر سے خالی
تجھ میں نہیں وہ روح بلالی
تو نے نمازوں سے رخ پھیرا
تجھ میں نہیں اب پختہ خیالی
آگ لگی ہے آگ مسلماں
جاگ مسلماں جاگ مسلماں

اگر چہ اس نظم کا تعلق ایک خاص موضوع اور ایک خاص صورت حال سے ہے لیکن اس کا لہجہ اب بھی بادۂ شبانہ کی سرمستیوں اور لذت خواب سحر کی آغوش سے نکل کر اپنے وجود اور سالمیت کے لئے زندگی کی رزم گاہ میں بے خطر کود پڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ جمالیات کا دلدادہ شاعر اپنے وطن کی آبرو بچانے کے لئے ''ہل من مبارز'' کا نعرہ جہاد بھی بلند کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے محبت ہے ایسی محبت ارتقائی منزلیں طے کر لیتی ہے تو اپنے دامن میں سارے ملک کو سمیٹ لیتی ہے اور جب وقت پڑتا ہے تو یہی جذبہ جوش وخروش سے ابل پڑتا ہے۔ اور شاعر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:۔

میں ہوں روح اس کی یہ میرا بدن ہے
میں اس کی جان اور یہ میرا تن ہے
وطن میری عزت وطن میری عظمت
وطن میرا تن میرا من میرا دھن ہے
میں جاگیر کے ٹکڑے ہونے نہ دوں گا
میں کشمیر کے ٹکڑے ہونے نہ دون گا
ہے کشمیر تقدیر میرے وطن کی
میں تقدیر کے ٹکڑے ہونے نہ دوں گا
میں اپنے وطن کے مقدر کا سورج
وطن کو بدلتا ہوا کیسے دیکھوں
چمن کو میں جلتا ہوا کیسے دیکھوں
ان آنکھوں سے ڈھلتا ہوا کیسے دیکھوں
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے
میں بلبل ہوں اس کا یہ میرا چمن ہے

شاعر شعوری طور پر آزادی ہند کے بعد نئے نئے تقاضے کا خوش آئند خواب دیکھنے کا مظہر ہے۔ حزن وملال شاعر کے نکتہ نظر میں گھل مل جاتے ہیں جس میں ارکان والفاظ کے آہنگ سے جوش وشدت پیدا کی گئی ہے۔ اجمل صاحب کی منظریہ نظمیں، ان کے مشاہدات، لطیف احساسات، برمحل تشبیہات و استعارات سے لفظ وبیان سے مزین ہے۔ اجمل سلطانپوری کی شاعری میں حسن کا سرچشمہ ذات باری تعالی ہے۔ وہی محسن کل ہے اور وہی خالق حسن بھی۔ کائنات میں ہر طرف اس کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں لیکن انفس وآفاق میں حسن کے جلوے جن کی نمود گوناگوں اور بوقلموں عنوانات کے تحت جس فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کئے انفرادیت کے حامل ہیں۔ اور ان جلووں کے اظہار کے سلیقے اپنے آپ میں بے نظیر اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

شاعری اجمل کے لئے ''یہی آخر کو ٹھہرا حسن ہمارا'' کے مصداق ہے۔ شاعر نشتر انجام کی خلش پر بات کو ختم نہیں کرتا وہ تہ جام کی جمہوری کیفیت سے نہیں اکتاتا۔ ان کا انداز فکر متحرک ہے اس شعلہ زود گذر کے شعری فن پاروں میں ایک دوسری ہی تصویر نظر آجاتی ہے جو کلام اجمل کو شادابیت سے منور کرتی ہے۔ ان کے کلام کا ارتقائی سلسلہ فکر ونظر کے اعتبار سے پختہ ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت کا حسن ان کی انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی نظموں میں اگر چہ ساخت اور ہیئت کا کوئی تجربہ نہیں ملتا تاہم ان کے بیان میں روانی اور زبان کی شیرینی کا جو لطف ہے وہ قاری اور سامع کو مسحور کر دیتا ہے۔ ان کی تمامتر شہرتوں کا انحصار ان کی نعتیہ شاعری ان کی غزل گوئی اور ان کی شاندار نظمیں ہیں ، جن میں قنوطیت کے بجائے مستقبل کے روشن امکانات ہیں۔ ان کی آواز آوازۂ عام ہے جس میں ایک قسم کی انفرادیت اور کشش ہے، زندہ احساس ہے فکر وفن کے اعتبار سے ان کی تخلیقات کا زمانی تجربہ ہماری امیدوں اور اعتماد میں یقین بھر دیتا ہے۔

اجمل سلطانپوری کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کس دبستان شاعری کا پیرو قرار دیا جائے۔ میر مومن کے، غالب واقبال کے، مجاز و فیض کے اشعار کے دروبست افکار کی تہوں اور تکنیک کی مزاج کا تجزیہ کا جائے تو آپ کی نظموں اور غزلوں میں مختلف دبستانوں اور مشاہیر کے اثرات ملیں گے۔ جا بجا ایسی چنگاریاں دبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جن کے شعلے کہیں اور نظر آئیں گے لیکن ان سارے اثرات کا امتزاج اجمل سلطانپوری کی افتاد طبع میں کچھ اس طرح پنہاں ہے کہ انھیں نہ تو کسی مخصوص دبستان کا پیرو قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ مشاہیر میں سے کسی کا شمع بردار۔ انھوں نے ہر شاخ سے خوشہ چینی کی ہے لیکن کسی شاخ کو اپنا شاخ نشیمن نہیں بنایا۔ ان کی نظموں میں تازگی ہے، جوش ہے، زود حسی ہے لیکن رفتہ رفتہ جوش سنجیدگی سے تازگی، پائندگی سے غور وفکر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور خود اعتمادی گہری ہوتی گئی۔

مجھے احساس ہے کہ متذکرہ بالا سطور میں اجمل شناسی کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو سکا ہے لیکن اجمل کیا ہیں اور کیا نہیں اس بحث کی گنجائش کے فاصلے کم ضرور ہوئے ہیں۔ اجمل کی خدمات اور کارنامے نا قابل فراموش ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ ان سے آنکھ بچا کر نہیں نکل سکتی۔ ''قفس تا قفس'' نہ مردہ پرستی کے خلاف علم جہاد ہے اور نہ زندہ پرستی کی روایت کا سنگ میل۔ محض ایک بڑے فنکار کے مرتبے سے آگہی کی کوشش ہے اور اس کی ادبی خدمات کا اعتراف اور بس!

ناسپاسی ہوگی اگر اجمل شناسی کے باب میں حبیب اجملی (الفاظ کے غبار میں) ڈاکٹر ڈی پی سنگھ (سابق صدر شعبہ اردو، انگریزی، گنپت سہائے پی جی کالج) اور کمل نین پانڈے حضرات کا نام نہ لیا جائے جنھوں نے مواد کی فراہمی میں جو تعاون کیا اس کے لئے لفظ شکریہ بہت کم ہے تاہم اس سے گریز اخلاقی جرم ہے۔ آپ حضرات کی بے لوث خدمتیں اہل سلطانپور کے لئے باعث افتخار ہیں۔ ●●

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

(1928-1992)

میرا کالم مجتبیٰ حسین

میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر پیار آتا ہے۔اگرچہ پیار اور ترحم دونوں ایک ہی وسیع جذبے کے ذیلی جذبے ہیں لیکن پیار چاہے بزرگ پر آئے یا دوشیزہ پر، پیار، پیار ہی ہوتا ہے۔کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا شمار مؤخر الذکر بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے۔ایک ایسا شباب جس کا تھوڑا سا حصہ بھی ہمیں پندرہ بیس برس پہلے مل جاتا تو ہم بھی وہ سب کچھ کر گزرتے جو آدمی کو کرنا چاہیئے۔بزرگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جنہیں دیکھ کر آدمی عبرت پکڑتا ہے لیکن بعض خوش نصیب بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی عبرت کے سوائے ہر چیز کو پکڑ لیتا ہے۔

جیسے تین سال پہلے ایک دن میں نے کنور صاحب کو دیکھ کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا تھا۔یہ اُس دن کی بات ہے جب دہلی میں ہر دن کی طرح بجلی فیل ہوگئی تھی۔مجھے اور کنور صاحب کو دہلی کی ایک پچیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر پہنچنا تھا اور لفٹ بند تھی۔کام چونکہ میرا تھا اسی لئے میں نے کنور صاحب سے کہا ''میرا کام اتنا ضروری نہیں ہے کہ آپ ساتویں منزل تک چڑھ کر جائیں اور پھر آپ کی عمر بھی تو 74 برس کی ہو چکی ہے''۔میرے اس جملے کو سنتے ہی اُن کے بڑھاپے پر شباب آ گیا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔میں انہیں منع کرتا رہا۔سمجھاتا رہا کہ میں نے یہ جملہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ 74 برس کے ہو گئے ہیں بلکہ اس لئے کہا ہے کہ میں 48 برس کا ہو چکا ہوں۔مسئلہ میرے ضعف کا ہے اُن کے ضعف کا نہیں مگر وہ نہ مانے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے بلکہ اکثر موقعوں پر تو دو دو سیڑھیاں ایک ہی قدم میں پھلانگ ڈالیں۔میں اُن کے پیچھے ہانپتا کانپتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔میرے روکنے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا۔بالآخر اس سفر میں ایک نوبت وہ بھی آئی جب وہ مجھ سے دو منزل آگے ہو گئے۔ان کے قدموں کی چاپ تو سنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہے تھے۔میں گرتا پڑتا ساتویں منزل پر پہنچا جہاں ہمیں ایک شخص سے ملنا تھا۔میں نے اپنی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ان صاحب سے پوچھا کہ کہیں کنور صاحب اِدھر آ تو نہیں گئے۔

وہ بولے ''کنور صاحب تو نہیں آئے۔البتہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ایک سردار جی کی جھلک دیکھی ہے جو بڑی تیزی سے اوپر جا رہے تھے''۔

میں نے کہا ''وہی تو کنور صاحب تھے جو آپ سے ملنے کیلئے اس عمارت میں آئے ہیں''۔

''تو پھر وہ اُوپر کیوں چلے گئے؟'' اُن صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا ''کچھ نہیں ذرا جوش جوانی میں اوپر تک چلے گئے ہیں۔ابھی آ جائیں گے''۔کچھ دیر بعد کنور صاحب نیچے آ گئے۔پتہ چلا کہ میرے جملے نے انہیں اتنا مشتعل کیا کہ تیرہ منزلوں تک چڑھتے چلے گئے۔تیرہویں منزل پر اشتعال کچھ کم ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ انہیں تو ساتویں منزل پر ہی رُکنا تھا۔

مجھ سے کہا ''تم کیسے جوان ہو۔سات منزلیں تک نہیں چڑھ سکتے۔کیا ابھی سے تم پر بڑھاپا آ گیا ہے۔مجھے دیکھو کہ 74 برس کا ہو چکا ہوں مگر آج بھی یہ حال ہے کہ ساتویں منزل پر کوئی کام ہو تو تیرہ منزل تک چڑھ جاتا ہوں''۔

میں نے اپنی ہار مانتے ہوئے معذرت کی اور اپنی صفائی میں ایک دانا کا قول انہیں سنایا کہ ''بیس برس کی عمر کا گدھا، ساٹھ برس کے آدمی سے کہیں زیادہ بوڑھا ہوتا ہے کیونکہ بڑھاپے کا تعلق کسی مخلوق کی عمر سے نہیں، اس کے قویٰ سے ہوتا ہے''۔

کنور صاحب اس قول سے ایسے ہی محظوظ ہوئے جیسے کہ ایک سچے سکھ کو ہونا چاہئے۔یہ واقعہ تین برس پہلے کا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی انہیں کسی عمارت کی ساتویں منزل پر جانا ہو اور لفٹ بند ہو اور کوئی اُن کے بڑھاپے کو للکارے تو وہ کم از کم بارہویں منزل تک ضرور چڑھ جائیں گے اور ہم جیسے نچلی منزل پر ہی کھڑے رہ جائیں گے۔

اُن کی اس اعلیٰ وارفع صحت کا راز نہ جانے کیا ہے۔سنا ہے کہ نوجوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔خالص چیزیں کھاتے تھے۔ہر قسم کی کشتیاں لڑتے تھے اور ہر قسم کا شکار کھیلتے تھے۔میں نے کبھی اُن کی صحت کا راز جاننے کی کوشش نہیں کی کیونکہ کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جنہیں اگر آپ جان بھی لیں تو اُن سے استفادہ نہیں کر سکتے۔آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک شخص کی عمر سو برس کی ہوگئی تو کسی نے پوچھا ''قبلہ! آپ نے یہ جو طویل عمر پائی ہے۔اس کا راز کیا ہے؟''

بزرگ بولے ''میری طویل عمر کا راز صرف اتنا ہے کہ جب تک میں تیرہ برس کا نہیں ہو گیا تب تک میں نے عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا''۔اب آپ ہی بتائیے اس طرح کے راز کا آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ادھر دس بارہ برسوں سے کنور صاحب نے اپنی داڑھی کو خضاب سے پاک کیا ہے

، ورنہ آج بھی یہ خضاب لگانا شروع کردیں تو ہم جیسوں سے نوجوان نظر آنے لگیں۔ البتہ آواز ایسی پرشباب، پاٹ دار اور رعب ودبدبہ والی پائی ہے کہ لگتا ہے گلے میں خضاب لگا رکھا ہے۔

یادشِ بخیر کنور صاحب کو میں نے سب سے پہلے 1967ء ؁ میں حیدرآباد میں دیکھا تھا۔ حیدرآباد میں ہم لوگوں نے مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور میں اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری تھا۔ کانفرنس کے تین اجلاس تھے۔ پہلا اجلاس لطیفہ گوئی کا تھا جس کی صدارت کنور صاحب کو کرنی تھی۔ دوسرا اجلاس مزاحیہ مضامین کا تھا جس کی صدارت آنجہانی راجندر سنگھ بیدی کو کرنی تھی اور تیسرا اجلاس مزاحیہ مشاعرہ سے متعلق تھا جس کی صدارت آنجہانی وی شنکر نے کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں کنور صاحب کسی بڑے عہدے پر فائز تھے یا نہیں۔ کچھ عہدیدار ایسے ہوتے ہیں جو بڑے عہدہ پر فائز نہیں رہتے بلکہ عہدہ اُن پر فائز رہتا ہے۔ ہر دم اپنی عہدیداری کو حاضر وناظر جانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کنور صاحب بھی اس طرح کے عہدیداروں ہوں گے مگر جب حیدرآباد آئے تو یوں لگا جیسے ہم میں سے ہی ایک ہیں۔ مزاح نگاروں کی اس کانفرنس کی کامیابی کی لوگوں نے پہلے ہی سے پیشن گوئی کردی تھی کیونکہ اس میں دو سکھ ادیب حصہ لے رہے تھے۔ بلکہ راجندر سنگھ بیدی نے تو حیدرآباد ایرپورٹ پر اُترتے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا ''میاں! مزاح نگاروں کی کانفرنس کی کامیابی کیلئے ایک ہی سردار کافی تھا۔ تم نے دو دو سردار اور وہ بھی بیدی سردار بلالیے۔ سونے پر سہاگہ اسی کو کہتے ہیں''۔

سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا یہ سب سے کامیاب اجتماع تھا۔ لطیفہ گوئی کی محفل کی صدارت چونکہ کنور صاحب کررہے تھے اسی لئے میں نے تمام لطیفہ گو حضرات سے کہہ دیا تھا کہ وہ سرداروں والے لطیفے ہرگز نہ سنائیں۔ اس پر بعض لطیفہ گو حضرات نے محفل لطیفہ گوئی میں شرکت سے معذرت کرلی کہ واہ صاحب یہ کیا بات ہوئی کہ محفل لطیفہ گوئی کی ہو اور اس میں سرداروں کا ذکر نہ ہو۔ خیر صاحب لطیفہ گوئی کی محفل ہوئی مگر میرے منع کرنے کے باوجود اس میں سرداروں کے لطیفے خوب سنائے گئے۔ تاہم اس صورتحال کیلئے میں ہی ذمہ دار تھا کیونکہ غیر سرداروں کو تو میں نے سرداروں کے لطیفے سنانے سے منع کیا تھا لیکن خود سرداروں سے یہ التجا نہ کی تھی کہ وہ اپنے بارے میں لطیفے سنانے سے گریز کریں۔ مجھے اب تک وہ محفل یاد ہے اور اس کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ کنور صاحب سے میرے مراسم کا یہ نقطہ ? آغاز تھا۔ اس دن سے آج تک زندہ دلان حیدراباد کو اُن کی سرپرستی اور شخصی طور پر مجھے اُن کی شفقت حاصل رہی ہے۔ مجھے یاد ہیکہ 1969ء ؁ میں ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں، میں دہلی آیا۔ اگرچہ میں اس ملازمت کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا لیکن بیدی صاحب مجھ سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی لوگوں سے میرے بارے میں سفارش کی۔ کئی لوگوں کو بلاوجہ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میں ذہین آدمی ہوں، قابل ہوں، اہل بھی ہوں اور نہ جانے کیا کیا ہوں۔ مگر میں نے انٹرویو میں ان کے سارے دعوؤں کی تردید کردی اور حیدرآباد واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد وہ زندہ دلان حیدرآباد کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد آئے تو خفا تھے کہ میں نے جان بوجھ کر انٹرویو میں اپنے آپ کو نااہل ثابت کیا تھا۔ میں نے اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا کہ کنور صاحب مجھے آپ سے ہی یہ شکایت ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کے بارے میں اس محکمہ کے ڈائرکٹر جنرل کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتادیا تھا کہ وہ اپنی کرسی کیلئے مجھے ایک خطرہ سمجھنے لگا۔ یوں بھی ایک محکمہ میں دو قابل لوگوں کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ اسی لئے واپس چلا آیا۔

کنور صاحب کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے کہ جس پر مہربان ہوتے ہیں، اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اسے آپ ان کی شفقت اور محبت نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جسے عزیز رکھتے ہیں اگر وہ نااہل بھی ہے تو اس میں اہلیت ڈھونڈتے ہیں، نالائق بھی ہے تو اس میں لیاقت تلاش کرتے ہیں۔ جاہل ہے تو اس میں علم کی کھوج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کے اطراف مجھ جیسوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

1972 میں جب میں دہلی آیا تو کنور صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سچ مچ مجلسی آدمی ہیں۔ وہ محفل میں ہوں تو کیا مجال کہ کوئی اور جان محفل بن جائے۔ اُن کی باتیں حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے عبارت ہوتی ہیں۔ محفل کی نبضِ اُن کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جس طرح کے لوگ ہوں اور جس طرح کا موقع ہو اس کے مطابق ایسی نپی تلی بات کرتے ہیں کہ سب کو سمجھ آجائے۔ محفل میں دس بارہ آدمی ہوں یا تیس پینتیس ہزار آدمی کنور صاحب سب کا مزاج جانتے ہیں۔

کنور صاحب اردو شاعروں کے عالی جاہ ہیں۔ شاعر اور ادیب انہیں احتراماً ''عالی جاہ'' کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کنور صاحب گھر پر نہ ہوں اور کوئی انہیں فون کرے اور ایسے میں مسز کنور مہندر سنگھ بیدی فون کا ریسیور اُٹھائیں تو وہ کہتی ہیں ''میں مسز عالی جاہ بول رہی ہوں''۔ اپنے شاعر دوستوں کو وہ خوب نوازتے بھی ہیں۔ اردو شاعروں کے مسائل اگرچہ بہت بڑے نہیں ہوتے لیکن ان کا حل تلاش کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے۔ کنور صاحب ان کے مسائل کو نہ صرف حل کرتے ہیں بلکہ انہیں پیدا بھی کرتے ہیں (مراد مسائل سے ہے) بھانت بھانت کے شاعر اُن کے اطراف جمع رہتے ہیں۔ جس پر مہربان ہوجائیں، اسے ہندوستان کے کونے کونے میں گھما دیتے ہیں بلکہ بیس بائیس برس پہلے وہ اردو شاعروں کی ایک ٹیم کو لے کر برطانیہ گئے تھے۔ اس ٹیم میں انہوں نے اکثریت ایسے شاعروں کی شامل رکھی تھی جو برطانیہ کی قومی زبان انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل برطانیہ نے ان شاعروں کو اور اُن کے کلام کو خوب سمجھا اور لطف اندوز ہوئے۔ ان شاعروں کیلئے بھی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیوں کہ پیلی بھیت یا پانی پت کے مشاعروں سے اچانک لندن کے مشاعرہ میں کلام سنانا کوے یار سے نکل کر سوئے دار چلے جانے کے مترادف تھا۔ اس کا ایک فائدہ اردو زبان و ادب کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے شاعر یوروپ کی ترقی اور چکا چوند سے اتنے مبہوت ہوئے کہ وطن واپس آکر ایک لمبے عرصہ تک کوئی شعر نہ کہہ سکے۔ ●●

بشکریہ میرا کالم مجتبیٰ حسین

THE SIYASAT DAILY,HYDERABAD

12 MAY,2018

انگریزی شاعری میں ماہِ دسمبر کا استعارہ

انوار فطرت

ہمارے ہاں اردو شاعری میں دسمبر کا مہینہ اداس رومانس کی علامت بن گیا ہے۔ بہت ہی اچھے شاعر اور افسانہ نگار عرش صدیقی مرحوم نے 1970 کی دہائی میں اپنی بیٹی کے انتقال پر ایک نوحہ ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' لکھی تھی، یہ نظم اردو کی کشید نظموں میں شامل ہے۔

اس نظم سے پہلے بھی دسمبر کے حوالے سے شاعری کی گئی ہوگی تاہم اس نظم کی اثرانگیزی نے بہت نظمیں کہلوائیں۔ ہمارے ہاں دسمبر کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو انگریزی شاعری میں موجود ہے۔ ذیل میں ایک نظم کا ترجمہ، بغیر تبصرہ دیا جارہا ہے، اس نظم میں اداسی اور افسردگی آپ ضرور محسوس کریں گے:

سارا ٹیزڈیل

سارا ٹریور ٹیزڈیل، سینٹ لوئس (میسوری) میں 8 جنوری 1884 کو پیدا ہوئی۔ اس کی پہلی نظم 1907 میں MirrorReedy میں اور پہلا مجموعہ Poems other and duse to Sonnets کے نام سے شائع ہوا تاہم اس کے دوسرے مجموعے Other and Troy of Helon Poems کی پذیرائی انتہائی رہی۔ اس کی شاعری میں نغمگی بہت ہے۔ سارا نے 1918 میں اسے اس کے مجموعے Songs Love پر پلیزر پرائز پیش کیا گیا۔ اس کا شوہر اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث اسے وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اپنے سابق ناکام عشق اور بڑھتی ہوئی تنہائی کے باعث اس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کی نظم ملاحظہ ہو:

نومبر کی ایک رات

وہاں دیکھو! روشنیوں کی لکیر
سڑک کے دونوں کناروں پر نیچے ستاروں کی زنجیر،
کیوں تم یہ زنجیر لا کر مجھے نہیں دے سکتے؟
میں اسے نیکلس بناؤں اور تم اس سے کھیل سکو
تم مجھ پر مسکرا رہے ہو جیسے میں ایک چھوٹی سی خواب دیکھنے والی بچی ہوں
جس کی آنکھوں کے پیچھے پریاں بسیرا کرتی ہیں
اور دیکھو! سڑک پر آتے جاتے لوگ ہمیں رشک سے دیکھ رہے ہیں
ہم بادشاہ اور ملکہ ہیں، ہماری شاہی سواری یہ موٹر بس ہے،
ہم اپنے غلاموں کو تمکنت سے دیکھ رہے ہیں
تم کیسے ساکت ہو! کیا تم مشقت کرتے رہے ہو
اور آج رات تھکے ہوئے ہو؟ کتنے طویل عرصے کے بعد میں نے تمہیں دیکھا ہے،
میرا خیال ہے تقریباً چار پورے دنوں کے بعد
میرے دل پر احمقانہ خیالات کا ہجوم ہے

اپریل کے اوائل کے پھولوں کی طرح
میں وہ تمہیں دوں گی سب اس سے پہلے کہ وہ مرجھا جائیں
وہ لوگ، جن سے میں ملی ہوں
کھیل جو میں نے دیکھا، معمولی، منتقل ہونے والی چیزیں،
جو بہت زیادہ پھیل جاتی ہیں یا بہت زیادہ سکڑ جاتی ہیں، سائے
جو کسی دیوار کے پہلو میں تیزی سے گزرتے ہیں،
ٹھہرتے ٹھہراتے یا شوخی کرتے۔۔۔اور پھر بھی سب حقیقت بن جاتے ہیں
اور یہاں میرے دل میں اپنے لیے مناسب جگہ بنا لیتے ہیں
جب تم انہیں دیکھ چکے، وہاں ایک پلازہ ہے
روشنیوں کی ایک جھیل! آج کی رات لگتا ہے
کسی طور تمام روشنیاں کھنچ کر تمہاری آنکھوں میں جمع ہوگئی ہیں
دیکھو! ہمارے نیچے وہ کھلا پارک
جس میں لاکھوں دیے روشن ہیں
ایک ماہرانہ ترتیب سے بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح
ہم نیچے انہیں دیکھ رہے ہیں، جیسے خدا
اپنے نیچے بہتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ کو
بادلوں میں الجھے ہوئے دیکھتا ہے
آؤ چہل قدمی کریں
ہم پارک تک پہنچ چکے ہیں
یہ ہمارا گلستاں ہے،
یہ تاریک اور ناشگفتہ دسمبر کی رات،
لیکن ہم اپنے ساتھ اپریل لائے ہیں، میں اور تم؛
ہم جہان بھر کو بہار کی پگڈنڈی پر لے چلتے ہیں
میرا خیال ہے وہ راستے، جو ہم چل کر آئے ہیں
ان پر پراسرار آگ نے ہمارے قدموں کے نشان ثبت کر دیے ہیں،
(یہ وہ) نفیس سونا (ہے)، جسے صرف پریاں دیکھ سکتی ہیں
صبح جب وہ درختوں کے کھوکھلے تنوں میں جاگے
اور اونگھتے پارک میں آئے، تو
سونے سونے رمنوں کے ساتھ چلتے دیکھا اور کہا ''لو دیکھو!''
وہ یہاں گئے، یہاں، یہاں اور یہاں! آؤ دیکھو،
یہاں ان کا بنچ ہے، میرے ہاتھ تھامو، ہم رقص کریں گے
اس کے گرد، ہوا کے چھلے میں اور بنائیں گے
اس کے گرد ایک دائرہ، جس میں سے صرف،

وہی گزر سکیں گے، جب لوٹ کر آئیں گے
جھیل کو دیکھو
تمہیں یاد ہے، ہم سوئے راج ہنسوں کو کیسے دیکھ رہے تھے؟
میرا خیال ہے، راج ہنس ضرور عالیشان خواب دیکھتے ہوں گے
لیکن آج
جھیل میں روشنیوں کے مہین عکس پڑے ہیں
جو ہلکے ہلکے لرز رہے ہیں
میری تمنا ہے کہ میں اس ٹھنڈے تاریک پانی میں سے تازہ سونے سے بنی ایک (روشنی)
اٹھا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں، اور دیکھو، دیکھو!
جھیل کے پاتال میں ایک ستارہ پڑا ہے، ایک ستارہ!
اور کتنا مدھم، موتی سے بھی زیادہ، تم اپنا
ہاتھ جھکا کر اسے میرے لیے نکال سکتے ہو؟
وہاں آج کی رات ایک ناتواں زرد چاند تھا
میں چاہتی ہوں تم اسے پیالے کی طرح
شبنم کے قطروں جیسے ستاروں سے بھر دو،
یہ کتنا ٹھنڈا ہے، روشنیاں تک ٹھنڈی ہیں
انہوں نے اپنے گرد کہرے کی شالیں اوڑھ رکھی ہیں دیکھو!
کیا ہو؟ اگر ہوا اس قدر مدھم سفید ہو گئی
کہ ہم ان راہوں میں اپنی راہ گم کر بیٹھے
جنہیں دھند کی دیواروں نے بنا ڈالا ہے،
جو اتنا ہی سکڑتی ہے، جتنا ہم اس پر چلتے ہیں
کیسی نقرئی تھی وہ رات!
وہ پڑا ہے ہمارا وہ بنچ، جہاں ایک دن تم نے
مجھے نئی طویل نظم سنائی تھی لیکن اب کتنا بدلاؤ آ چکا ہے
عجیب بات ہے کہ کہرے کے پردے میں یہ دوست درخت اجنبی دکھائی دیتے ہیں
ہوا نہیں چل رہی اور پھر بھی دھند میں
عظیم خم چکر کھا رہے ہیں اور ہر پل تبدیل ہو رہے ہیں
تم ذرا چلو، مجھے یہاں رک کر (تمہیں) دیکھنے دو
تم بھی مجھے اجنبی اور دور دکھائی دیتے ہو
میں حیران ہوا کرتی ہوں کہ یہ پارک کیسا لگے گا
اگر ایک رات ہم اسے بالکل خالی پا سکیں۔۔۔
(جب) یہاں کمر کے گرد بازو ڈالے کوئی جوڑا نہ ہوگا
(اور) ہمارے خوابوں میں نقب لگاتی سرگوشیاں نہ ہوں گی۔
اور ایسا ہو گیا، ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے
ہم اب اس پشمینہ عالم میں اکیلے ہیں؛
ستارے تک نہیں رہے۔
ہم دو اکیلے!

●●

سہ ماہی
میرا روڈ، تھانے

ادب گاؤں

۵۰ روپے

ترتیب و تہذیب

اشتیاق سعید

9930211461

ملبیری کے آس پاس

شاعر: عطاؑ الرحمٰن طارق

ایڈ شاٹ پبلیکیشنز، ممبئی

خوشبو کے حوالے سے

شاعر و ناشر: بدر محمدی

نوجوان شاعر، حافظ و قاری **ناظم اشرف** کا شعری مجموعہ

شاعری تک آگئے

سنہ اشاعت: ۲۰۱۹

فیض احمد فیض کی شاعری کا ایک اکیڈیمک جائزہ

ظفر اقبال

فیض کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، میں خود ان کے مداحین میں شامل ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ فیض کے شعر میں ارتفاع تو ہے، گہرائی نہیں ہے اور اس کے کسی شعر کے ایک سے زیادہ معانی بھی نہیں نکلتے۔اس پر مجھے حسن نثار کا فون آیا کہ یہ بات تو فیض کی شاعری پر آج تک کسی نے نہیں کہی، میرا جواب تھا کہ آخر کسی کو تو یہ بات کہنی ہی تھی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ شاعری کے جدید نظریات کے مطابق، شعر کو کثیر المعانی ہونا چاہیے اور اس سے ابہام کا تقاضا بھی کیا جاتا ہے، لیکن فیض کی بالخصوص غزل ہمیں ان دونوں آلائشوں سے پاک نظر آتی ہے۔

پھر ہم نے دیکھا ہے کہ فیض کا طرزِ بیان وہی ہے، جو تقسیم کے وقت تھا اور اس عرصے میں زبان نے جو نئی کروٹیں لی ہیں یا جس حد تک اپنا فیشن تبدیل کیا ہے، بالخصوص جدید طرزِ احساس کو بھی فیض نے کوئی گھاس نہیں ڈالی، پھر فیض کی غزل میں کوئی ڈائیورشن یا ڈائیورسٹی نظر نہیں آتی اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ساری عمر ایک ہی غزل لکھتے رہے ہیں۔ فیض ایک نظریے کے تحت شعر کہتے تھے اور میری ناقص رائے میں ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ سیاسی اور صحافیانہ ہے، کیونکہ ان کا تعلق سیاسی نظریے سے بھی تھا اور صحافت کے ساتھ اس طرح کہ وہ ایک عرصے تک پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ یہی صورت حال ایک اور نظریاتی شاعر احمد ندیم قاسمی کی بھی تھی؛ حالانکہ شاعر کسی سماج سدھار تنظیم کا رکن یا اخبار کا تجزیہ نگار نہیں ہوتا، لیکن فیض نے کم و بیش یہ دونوں کام کیے؛ چنانچہ ان کی شاعری کا بہت تھوڑا حصہ ایسا رہ جاتا ہے، جو خالص شاعری کی ذیل میں آتا ہے اور جس پر ہمیں گزارہ کرنا پڑتا ہے۔

یقیناً یہ موضوعات شاعر کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہوتے، لیکن سوال صرف تناسب کا ہے، جبکہ نظریاتی شاعر پہلے نتیجہ نکالتا ہے اور پھر اس کے مطابق نظم تخلیق کرتا ہے اور فیض کمیونسٹ پارٹی کے بھی باقاعدہ رکن تھے اور لینن پرائز انہیں ان کے نظریے کی بنیاد پر دیا گیا، محض شاعری پر نہیں۔ فیض نے سیاسی نظریے ہی کی بنیاد پر گل و بلبل، باغ و باغباں کے معنی بھی تبدیل کر دیئے، اس لئے ہمیں غالب کے زندان اور فیض کے زندان و قفس میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ ان استعاروں سے فیض نے اپنے سیاسی نقطۂ نظر کے مطابق کام لیا۔

ڈاکٹر ابرار احمد لکھتے ہیں "باقی سبھی اہم شاعر ہم تک گائیکی کے ذریعے پہنچے، جن میں ناصر کاظمی، منیر نیازی اور فیض و فراز سبھی شامل ہیں، لیکن ظفر اقبال واحد شاعر ہے، جو ہم تک کتاب کے ذریعے پہنچا"۔ یہ بات اگر میری تعریف میں ہے تو اسے نقل کرنے پر معذرت چاہتا ہوں اور اگر میں لوگوں تک گائیکی کے ذریعے نہیں پہنچا تو یہ میری نالائقی ہو سکتی ہے، جسے میں تسلیم کرتا ہوں۔ فیض کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے رومان اور مزاحمت کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، لیکن فیض نے جس مجبور و مقہور طبقے کیلئے شاعری کی ہے، فیض کا خود اس طبقے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ فیض نے جس طبقے کیلئے اتنی زوردار شاعری کی، کیا وہ شاعری اس طبقے تک پہنچی؟ ہرگز نہیں، بلکہ اس سے بھی وہی ایلیٹ طبقہ لطف اندوز ہوتا ہے، جو فیض کا اپنا طبقہ تھا؛ چنانچہ فیض کا یہ سارا نظریاتی کلام اس طبقے کیلئے محض ایک ذہنی عیاشی کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی کتابیں ان حضرات نے اپنے شیلف سجانے کیلئے رکھی ہوتی ہیں۔

پھر جو ہر سال فیض میلہ منایا جاتا ہے، اس کے کرتا دھرتا اور شرکاء بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور کوئی یہ تردد نہیں کرتا کہ اس جشن میں اُن لوگوں کو بھی شامل کیا جائے، جن کیلئے فیض نے شاعری کے انبار لگا رکھے ہیں۔ میں نے ایک بار تجویز پیش کی تھی کہ فیض کے کلام میں سے انتخاب کر کے اس کا پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کروا کر پیپر بیک کتابوں پر پمفلٹس کی شکل میں خصوصاً دیہات میں رہنے والے ان لوگوں تک پہنچایا جائے، جسے پڑھ کر ان میں تحریک پیدا ہو کہ وہ خود بھی اپنی حالت کو تبدیل کرنے کے بارے سوچ بچار کریں، کیونکہ وہ اس بات سے صریحاً بے خبر ہیں کہ فیض نے ان کے بارے میں کیا کچھ لکھ رکھا ہے، جبکہ فی الحال تو فیض کے انقلابی کلام کا صریحاً غلط استعمال ہی ہو رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیض ?، صوفی تبسم سے اصلاح لیا کرتے تھے اور جب صوفی صاحب کا انتقال ہوا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور شاید اسی لئے فیض کے آخری دنوں کے کلام میں وزن وغیرہ کی فنی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اوپر مجید امجد، منیر نیازی اور ناصر کاظمی کا ذکر آیا ہے، جنہوں نے کسی سیاسی یا غیر سیاسی نظریے کا سہارا نہیں لیا، جبکہ مزاحمت اور مایوسی کے آثار ان کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد کے ہاں بھی ایسے جذبات دستیاب ہے، لیکن ایک حُسن تناسب کے ساتھ؛ البتہ حبیب جالب کی شاعری، وہ جیسی بھی تھی، اُن طبقات تک کسی حد تک پہنچی ضرور، جن کیلئے تخلیق کی گئی تھی، جبکہ فیض کی ایسی شاعری مراعات یافتہ طبقے تک ہی محدود رہی۔ "سر عام" نامی میرے مجموعے میں صرف اسی طرح کی غزلیں ہیں اور جن کی تحسین بھی ہوئی، لیکن کتاب کے فلیپ میں، میں نے اسے اپنی کم تر درجے کی شاعری قرار دیا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اختلاف رائے کے بغیر ادب جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں فیض کے ماننے والوں میں سے ہوں، اسی لئے میں نے اس کا نوٹس بھی لیا ہے کہ میرے نزدیک یہ سوالات اور تحفظات موجود تھے، جو میں نے بیان کر دیئے ہیں۔ میں غلط بھی ہو سکتا ہوں، لیکن میں اپنی بات کہنے کے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا کہ یہ میری مجبوری بھی ہے اور میں یہ کام کرتا بھی رہتا ہوں۔ ادب میں رعایتی نمبر نہیں ہوتے۔ میں کسی کو رعایتی نمبر دیتا بھی نہیں، کیونکہ میں خود کسی سے رعایتی نمبروں کا طلبگار نہیں ہوتا! ●●

بشکریہ روزنامہ دنیا (۲۱، نومبر ۲۰۱۹)

کامران ندیم

شاعر، محقق کامران ندیم کی کتاب "مہا بھارت" شائع ہوگئی ہے۔ جدید اردو انتقادت اور تحقیق میں نہ ہونے کے برابر کام ہوا۔ کامران ندیم کی زندگی نے وفا نہ کی جب وہ اس کتاب کا آخری حصہ لکھ رہے تھے تو وہ اس دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کتاب کا آخری حصہ انکی اہلیہ فرح کامران نے بڑی جانفشانی اور محنت سے تدوین کر کے مکمل کیا۔ فرح کامران نے اپنے "پس نوشت" میں لکھا ہے "مہا بھارت اب آپ کے ہاتھ میں ----بہت کوشش کے باوجود بھی مہا بھارت مکمل نہ ہو سکی۔ امید ہے اس چراغ سے کوئی اور چراغ جلے گا اور کوئی اس کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھائے گا۔ میرے کان میں اب بھی سرگوشیاں ہوتی ہیں-----فرح---- یہ کتاب مجھے زندہ رکھے گی، دل میں ایک خواہش بار بار سر اٹھاتی لیکن بعض بار اٹھانے بہت مشکل ہوتے ہیں اور ان کا اٹھانا ممکن نہیں ہوتا تو دیکھئے کہ آنے والا وقت کیا فیصلہ کرتا ہے؟"} صفحہ {20 دینا مین کئی کتابیں مصنف کی زندگی میں مکمل نہیں ہوئی کافکا اپنا ناول بھی وہ مکمل نہ کر سکے تھے۔ شبلی نعمانی کی کتاب "سیرت النبی" کی آخری جلد اپنی موت کے سبب مکمل نہ کر سکے اس کو ان کے شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ کتاب کا دیباچہ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے-- لکھتے ہیں۔" مہا بھارت کی کہانیاں ہمارے اجتماعی شعور اور مشترک روایت کا حصہ کچھ اس طرح بن گئی ہیں کہ شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے مہا بھارت کی کہانی نہ سنی ہو۔"} صفحہ {6 اس کتاب میں شامل مضامیں کی فہرست دیکھ قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتاب کتنی محنت، عمیق مطالعے اور فکری عرق ریزی کے بعد لکھی گئی۔

*"مہا بھارت" کو حاصل کرنے کے لیے اس پتے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے:

booktime786@gmail.com

بشکریہ جناب احمد سہیل

غنچے کے مزار پر لکھی نظمیں

کشور ناہید

چند سال ہوئے کوہستان کے علاقے میں شادی کے موقع پر
لڑکے ڈانس کر رہے تھے اور لڑکیاں تالی بجا رہی تھیں۔ جرگے نے ان سب کو عدالت کے منع کرنے کے باوجود قتل کر دیا۔ یہ واقعہ مجھے اسلئے یاد ا? یا کہ وزیرستان کے شاعر اور فوٹو گرافر احسان اللہ نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں شادیوں پر مرد عورتیں اکٹھے رقص کرتے تھے۔ جسکو ''رتن'' کہا جاتا تھا یہ دونوں باتیں مظہر ہیں اس صورت کی کہ پاکستان کا معاشرہ کتنا ابتر ہو گیا ہے۔ ابھی سندھ میں تیرہ سالہ لڑکی نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ اسکے باپ کا نام لڑکی کو معلوم نہیں۔ ماں باپ نے بھی گھر سے نکال دیا وہ جوا? جنگل پناہ گاہوں کا چرچا ہے وہ کیا عورتوں کیلئے نہیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اول تو سیاسی پارٹیاں خود بھی بحران کے علاوہ شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔ ویسے بھی ان جماعتوں میں میری بھاوج اور تیری بہن کے علاوہ اور کون ا? یا ہے، سوائے نفیسہ یا شیری رحمان کے۔ انکو بھی اپنے گرفتار رہنماؤں کے بارے میں گفتگو سے فرصت نہیں ملتی۔ اب جبکہ افغانی عورتوں نے بارودی سرنگیں صاف کرنا شروع کر دی ہیں۔ وزیرستان میں بھی یہ تیز اور جلدی اسلئے کیا جائے کہ ابھی گزشتہ ہفتے ہمارے جوان بارودی سرنگوں کے پھٹنے کے باعث شہید ہو گئے تھے۔
ان واقعات کو لکھتے لکھتے میری نظر ایک مضمون پر پڑی جو میں ایک مدت سے تلاش کر رہی تھی۔ سبب یہ کہ افغانستان سے ہجرت کرنے والی اور طالبان سے تنگ ا? ئی خواتین کچھ تو لکھ رہی ہوں گی فوراً میری نظر فوزیہ رہگزر کی شاعری پر پڑی، اس دیار میں عورت کا کوئی نام نہیں۔

''اے عزیز خاتون، اے تنہا دردمند، میں تمہارے شکستہ چہرے پر زردی کھنڈتی دیکھ رہی ہوں۔ تم نے اپنی سرکشی قفس کے درد سے بھرپور گوشے میں مدفون کر دی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ''ایک شہرِ بینور اور ایک شہر بےچراغ کی رہائشی ہو گئی ہو''۔ کتاب کا دوسرا صفحہ پلٹا شاعرات پہ قدغن کا منظرنامہ سامنے تھا۔

میں نے اپنے سبھی اشعار کا سر قلم کر دیا اور لفظ عشق سنگسار کر ڈالا۔ افغان عورت کو الفاظ کا رفیق نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں تو شاعرہ کا نام بھی نہیں تھا۔ اگلے صفحے پر زہرا زیدی کی نظم نے پکڑ لیا۔ ''کتابیں میرا مدفن بنیں گی اور تم انہیں ا? گ لگا دو گے۔ میرے تمام جسم سے جلے ہوئے اشعار کی بو اٹھے گی۔ میں کاغذ کے تراشے جھاڑو پھیر کر چنبیلی کے پودے کے پاس اکٹھا کروں گی۔ میں اندھی، گونگی بھی ہو جاؤں گی، تم عالم مستی میں رقص کرو گے اور راکھ اڑا دو گے، میں گریہ کروں گی اور چنبیلی کے غنچوں سے دل لگاؤں گی، اب بنی ہوں مگر گرہستن اندھی اور گونگی اور میرے جسم سے ادھ جلے اشعار کی بو اٹھ رہی ہے''۔

یہ نظم پڑھنے کے بعد، میں نے کتاب بند کر دی۔ یہ خواتین افغانستان سے باہر بلکہ بہت سی ایران میں ہیں مگر اپنے اوپر سامراج کے ظلم اور پدرشاہی نظام کو نہیں بھولی ہیں۔ انہیں افغانستان میں طالبان کے دور حکومت میں سرعام تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ نظمیں اسلئے بھی ا? پ کو سنا رہی ہوں کہ ابھی تک طالبان جو یقیناً، نئی ا? نے والی حکومت میں شریک کار ہوں گے، وہ کیا عورتوں کے ساتھ وہی سلوک کریں گے۔ ایک اور شاعرہ لکھتی ہے۔ ''ہماری ا? نکھوں کے دریا پر بند نہ باندھو، میرا دل پتھر اور سیمنٹ سے خوف زدہ ہے۔ مت کہو۔ تنہائی خوبصورت چیز ہے۔ میرا دل دیواریں خوب پہچانتا ہے''۔

ایک اور شاعرہ کی نظم کا حصہ ''مجھے کتنے سمندروں جتنا رونا پڑے گا کہ میرے دکھوں کے مرکز میں گھری ہوئی گریہ و زاریاں ا? زاد ہو سکیں۔ مجھے اپنے خدوخال بنانے والی مبہم لکیروں سے نفرت ہے۔ میں کبھی انہیں پہچان نہ پائی۔ مجھے پتھر کی شفاف دیواروں سے وحشت ہے''۔

اب ایک نظم جو اس بچے کے نام جو ہجرت کی یخ بستگی میں مر گیا ''میں تمہیں تا ابد یاد رکھوں گی اور تمہارے ہاتھوں کی یخ بستگی کا قصہ ہر ایک کو سناؤں گی۔ اور تمہارے سرد ننھے وجود کی کہانی۔ گرم لحاف میں خوابیدہ ہر شخص کو سناؤں گی اور تمہاری ماں کے خاک پہ قطرہ قطرہ ٹپکتے ا? نسوؤں کا مقصد/ کاغذ پہ اتاروں گی، مہاجرین ترین بچے، کونسی زمین تمہارے تن رنجیدہ کی پناہ گاہ بنی''۔

جنگ کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل کو گزشتہ 20 برس سے افغانستان میں موجود اور دیگر ممالک میں ہجرت کرنے والیاں کیسے سنا رہی ہیں۔ یہی حال سوڈان، یمن اور شام میں بھی ہے۔ پاکستان میں بھی کوئی بہت اچھی صورتحال نہیں ہے۔ پھر بھی ہم جیسے گزشتہ پچاس برس سے بول رہے ہیں۔ عاصمہ جہانگیر، فہمیدہ ریاض، پروین رحمان اور رضیہ بھٹی کے علاوہ بینظیر نے بھی حق و صداقت کے لئے جان دی۔ ●●

مجروح کا نام ان کے تغزل اور شعری کمال کی وجہ سے ہمیشہ روشن رہے گا: پروفیسر گوپی چند نارنگ

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ’مجروح سلطانپوری صدی سمینار‘ کا انعقاد

30 نومبر، نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر مجروح سلطانپوری کے جنم صدی کے موقع پر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے 30-29 نومبر 2019 کو اکادمی آڈیٹوریم، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں دو روزہ سمینار کا انعقاد کیا۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز نقاد، دانشور پدم بھوشن گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مجروح کا نام ان کے تغزل اور شعری کمال کی وجہ سے ہمیشہ روشن رہے گا۔ مجروح سلطانپوری کا کمال یہ تھا کہ فارسی اور اردو شاعری کی غزلیہ روایت کی روح کو انھوں نے جذب کر لیا تھا اور ان کی آواز میں ایسا جمالیاتی رچاؤ اور کشش پیدا ہو گئی تھی کہ ان کی بات دل پر اثر کرتی تھی۔ ان کی شائستہ اور دردمند آواز میں از دل خیزد و بر دل ریزد والی کیفیت تھی۔ ایک زمانہ تھا جب ترقی پسندوں نے غزل کی شدید مخالفت کی تھی، مجروح سلطانپوری کا کارنامہ یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے ترقی پسندوں کا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی غزل سے اپنی وفاداری کو ترک کیا۔ یہ ان کی سلامتی طبع اور خوش مذاقی کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ تغزل اردو شاعری کا جوہر ہے اور اس سے ہاتھ اٹھانا گویا شعریت سے منھ موڑنا ہے۔

اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تمام مقالہ نگاروں اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں مجروح کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب شین کاف نظام نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔

صدارت اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر مادھو کوشک نے کی اور مجروح سلطانپوری کے فلمی نغموں اور ان کی غزلیہ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنے عہد کا مقبول ترین شاعر قرار دیا۔ آخر میں اکادمی کے ہندی ایڈیٹر انوپم تیواری نے تمام شرکا اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف نقاد، شاعر اور ادیب پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ مجروح نے فلمی گیتوں میں نیا انقلاب پیدا کیا۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ اس اجلاس میں جواں سال ناول نگار رحمٰن عباس نے مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور ان کے ابتدائی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ●●

گوا میں اردو کو جائز مقام دلانے کی یقین دہانی

اردو کی صورت حال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور ایجوکیشن سکریٹری گوا کے مابین تبادلۂ خیال

پنجی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے گوا کے حالیہ دورے کے دوران ریاست کی ایجوکیشن سکریٹری محترمہ نیلا موہنن سے ملاقات کی اور ان سے ریاست میں اردو کی صورت حال اور اردو تعلیم و تربیت کے شعبے میں درپیش مسائل و امکانات پر گفتگو کی۔ اس گفتگو کے دوران جن اہم نکات پر تبادلہ خیال کیا گیا ان میں درجہ پنجم سے اوپر کی کلاسوں میں بطور مضمون اردو تعلیم کے آغاز کو منظوری نہیں دینا، اسکولوں کے نصاب میں اردو بطور مضمون شامل ہونے کے باوجود ریاستی حکومت کا مستقل اساتذہ کی بحالی نہ کرنا اور گذشتہ سات برسوں سے ضلع اسکول انسپکٹر کے ذریعے معائنہ نہ کرنا بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اسکولوں کے نمائندوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہاں اردو کی نصابی کتابیں وقت پر مہیا نہیں کی جاتی ہیں۔ برسر روزگار اردو اساتذہ کے لیے تربیت کا کوئی معقول نظام نہیں ہے جس سے ان کی تدریسی صلاحیتیں مزید بہتر ہو سکیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے ایجوکیشن سکریٹری سے خاص طور پر اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کی سمت میں کوشش کرنے کی درخواست کی تاکہ ریاست میں اس اردو زبان کا فروغ ہو جو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی ایک روشن علامت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان کو عام کرنے کے لیے ریاست میں ایک اردو اکادمی قائم کی جانی چاہیے تاکہ اردو زبان کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے چلائی جا رہی اسکیموں کا ریاست میں نفاذ ہو سکے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ گوا کی ریاست میں اقلیتوں کی بھی ایک معتد بہ آبادی ہے اسی لیے اقلیتی آبادی والے علاقوں کے سرکاری اسکولوں میں اردو کو بطور تیسری زبان پڑھانے کا نظم بھی کیا جائے۔ گفتگو کے دوران محترمہ نیلا موہنن نے کہا کہ ہم قومی اردو کونسل کے ساتھ اردو کے فروغ کے لیے مفاہمت نامے پر دستخط کریں گے تاکہ ریاست میں اردو کو جائز مقام مل سکے۔ ریاستی حکومت کے ذریعے کرائے جانے والے پروگراموں میں بھی قومی کونسل کے ذریعے کلچرل پروگرام کے انعقاد کرانے کی بھی درخواست کی گئی۔ ایجوکیشن سکریٹری نے یقین دلایا کہ گوا میں پرائمری سطح پر جتنے بھی سرکاری و غیر سرکاری اسکول ہیں ان سب میں اردو کو بطور تھرڈ لینگویج پڑھایا جائے گا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ قومی اردو کونسل نصابی کتابوں کی اشاعت میں گوا سرکار کو تعاون دے گی۔ ●●

سن تو سهی جهاں میں هے تیرا فسانه کیا

مرزا خلیل احمد بیگ،لکھنؤ

'سبق اردو' شمارہ نمبر ۴۷ ایک عرصے کے بعد موصول ہوا شکریہ۔امید ہے کہ آئندہ بھی اسے آپ بھیجتے رہیں گے۔مضامین اور شعری تخلیقات کا انتخاب بہت خوب ہے۔البتہ آپ نے اپنے اداریے میں جو یہ لکھا ہے کہ "دراصل ہندی، اردو ایک ہی بھاشا ہے۔" اس سے مجھے سخت اختلاف ہے۔اس بات پر گیان چند جین سے بھی میرا سخت اختلاف تھا۔

اس اداریے میں آپ نے آگے چل کر یہ لکھا کہ گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' 'اردو ادب کے اثاثہ کا حصہ بن چکی ہے۔' گیان چند جین کی متذکرہ کتاب تو مدت ہوئی ردکی جا چکی ہے۔

خطوط نہ کے برابر آتے ہیں، واٹس اپ پر کچھ محبان اردو، سبق اردو کے تاثرات ضرور موصول ہوتے رہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کے توصیفی خطوط کہ کچھ رسالہ پڑھ کر اور کچھ فہرست پر سرسری نظر دوڑا کر لکھے گئے ہوتے ہیں۔اس طرح کے مکتوبات شائع کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔خط تنقیصی بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں ہے۔تاثرات عطا کرنے والے قارئین رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔اس لیے ہم تمام قارئین سے بہت گزارش کرتے ہیں کہ وہ جو بھی رسالہ پڑھیں اس کے مدیر کو اپنے تاثرات ضرور بھیجیں۔واٹس اپ بہت آسان ذریعہ ہے اور قابل قبول بھی۔اور اگر کوئی مدیر اتنا غریب ہے کہ وہ واٹس اپ کی سہولت نہیں حاصل کر سکتا تو اسے رسالہ بند کرکے پہلے واٹس اپ اور ای میل کی سہولت حاصل کرنی چاہیے کہ یہ دور جدید ہے ڈاکخانے سے شکایت غالب کو تھی، ہم بھی شکایت کر کے آخر کیا پائیں گے۔مدیر

INTERNATIONAL REFEREED JOURNAL

ISSN 2321-1601

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chouki,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi, UP,INDIA

EDITORIAL BOARD

INDIA

1.PROFESSOR KHAWAJA IKRAM UDDIN
DEPT.OF URDU,JNU,DELHI
2.PROFESSOR IBNE KANWAL
DEPT.OF URDU,DELHI UNIVERSITY,DELHI
3.PROFESSOR SHAHZAD ANJUM
HOD ,JAMIA MILLIA ISLAMIA
4.PROFESSOR SHAIKH AQUIL AHMAD
DEPT.OF URDU,SATYAWATI COLLEGE,(DELHI INIVERSITY)
5.DR.ZEBA MAHMOOD
HOD,DEPT.OF URDU
G.S.P.G.COLLEGE,SULTANPUR(UP)
6.DR.AJAY MALVIYA,ALLAHABAD
EDITOR KITABI SILSILA "TAKHLIQAAT"

FOREIGN

1.PROFESSOR NASIR ABBAS NAYYAR
FICTON WRITER &CRITIC
2.PROFESSOR SOYA MA NE,WRITER
JAPAN
3.DR. IBRAHIM MOHD IBRAHIM
DEPT. OF URDU,AL-ALAZHAR UNIVERSITY,EGYPT
danish4@hotmail.com
4.PROFESSOR SOHAIL ABBAS
DEPT. OF URDU,UNIVERSITY OF TOKYO
abbaskhansuhail@gmail.com
5.DR.ALI BYAT
DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN
bayatali@ut.ac.ir

CHIEF EDITOR: DR. DANISH ALLAHABADI